ہفت روزہ
الفتح
کراچی

نیا لندن پلان

ایوب سے بات چیت کی تفصیلات



قیمت { ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ۱٫۰۵ پیسے

۲۴ — ۳۱ اگست ۷۲ء

شفیق احمد شفیق ۔ ڈھاکہ

غزل

گو، ہر نفس گراں ہے مگر جاگتے رہو
وارفتگانِ بنتِ سحر جاگتے رہو

ظلماتِ شب ہیں گھات میں آنکھیں نہ بند ہوں
فکرِ متاعِ جاں ہے اگر جاگتے رہو

آئیں گے لوٹنے کو تمہیں خضر بن کے لوگ
اے شبروانِ سیر و سفر جاگتے رہو

جادو نہ شب پرستوں کا ہو جائے کارگر
تم لے کے معجزاتِ نظر جاگتے رہو

ابھرے گا شب گزیدہ اُفق سے پھر آفتاب
ہر ذرّہ پھر بنے گا شرر جاگتے رہو

سو جائے زخمِ دل نہ ہو کم دردِ دل کی لہر!
کچھ اس ادا سے تا بہ سحر جاگتے رہو

رونق چمن کی لوٹ لے نہ گلچیں کا دستِ جور
ہر غنچہ بن گیا گلِ تر جاگتے رہو

لایا ہے کاروانِ سحر مژدۂ نشاط
ہوتا ہے چاکِ شب کا جگر جاگتے رہو

پھر تہمتوں کے سنگ کی بارش ہے آج شب
کردار ہو نہ زیر و زبر جاگتے رہو!

سوئے جہاں کہ درد بے پاؤں آ گیا
خطرے میں پھر ہے سارا نگر جاگتے رہو

بن کر شفق نہ ابھرے افق پر لہو شفیقؔ
ظلمت کرے نہ قتلِ سحر جاگتے رہو

ادارِیہ

کسانوں پر ظلم

صوبہ سرحد میں کسانوں پر مظالم شدت اختیار کر رہے ہیں۔ کسان جس جوانمردی بہادری اور شجاعت سے صورتِ حال سے نمٹ رہے ہیں۔ وہ نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں کے مظلوم عوام کے لئے انقلابی راہ متعین کر رہے ہیں۔ ظالموں کا اس پامردی سے مقابلہ صرف اور صرف انقلابی ہی کر سکتے ہیں اور یقیناً فتح ان کی ہوگی۔

صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی مخلوط حکومت ہے۔ اس حکومت کے اربابِ اختیار اور سیاسی قائدین اپنے بیانات کے ذریعے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہیں کہ وہ مزدوروں، کسانوں اور مظلوم طبقات کے بہی خواہ اور دوست ہیں۔ اس کی نمائش کیلئے اُن کے وفود لسانی تنازعات کی آڑ میں ہونے والے ہنگاموں پر آنسو بہانے سندھ بھی آئے تھے۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم ہی عوام کے خیر خواہ ہیں اور باقی اللہ اللہ خیر سلا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں اربابِ اختیار خوانین کے ساتھ مل کر کسانوں کے قتلِ عام میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ اُن کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا ہے عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے اور خوانین ننگے مظالم کے ذریعے کسانوں کو کچلنے میں مصروف ہیں۔ حکومتِ سرحد ان تمام واقعات کو نہ صرف خاموش تماشائی کی طرح دیکھ رہی ہے بلکہ خوانین کو مواقع فراہم کر رہی ہے کہ وہ ظلم و تشدد کو تیز کرے۔

یہ سب کچھ اُس حکومت کے دور میں ہو رہا ہے جو یوم بابڑہ مناتی ہے۔ حالانکہ اُس کے اپنے دورِ سرحد کے کسانوں کا ہر گھر بابڑہ فائرنگ کی یادیں تازہ کرتا رہا ہے۔ اِن سے بھلا پوچھا جائے کہ تمہارے بعد آنے والے کس انداز میں کسانوں کے قتلِ عام اور تمہاری وحشت و بربریت کا ماتم کریں گے۔

ہنگیان، تخت بھائی، چارسدہ، مردان اور شمالی ہشتنگر میں کسانوں پر مظالم کی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

الفتح
کراچی

جلد ۳ ، شمارہ ۱۵

۲۴ - ۳۱ اگست ۱۹۷۲ء

نگران

شوکت صدیقی

مدیر

ارشاد راؤ

نائب مدیر

وہاب صدیقی

بدلِ اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۴۰ روپے	۱۷ روپے

بحرین، کویت :- ۴۰ فلس دوبئی قطر: ۵،۰ درم

سعودی عرب :- ۱۵ قرش ۔ انگلستان: ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت

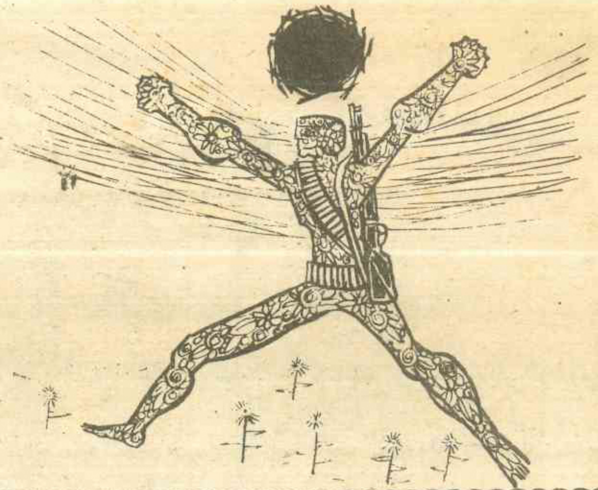
ہفت روزہ الفتح، ۸۰-ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی، ۲۹

ایڈیٹر پبلشر :- ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

ٹیلیفون :- ۴۱۲۲۷۴





بھارت میں مسلّح جدوجہد

ایک ماہ میں کسان گوریلوں کی ۹ مسلّح کارروائیاں

قُطبُ الدّین احمد

موجودہ دَور میں جبکہ سامراج اپنی موت سے قریب تر ہوتا جارہا ہے بھارت بھی آتش فشاں کی طرح کسی وقت پھٹ پڑنے والا ہے۔ بھارت کے باشعور عوام تبدریج بیدار ہورہے ہیں اور اپنی مکمل آزادی کی جنگ میں برسرِپیکار ہیں۔ عوامی مسلّح جدوجہد جنگل کی آگ کی طرح مغربی بنگال، پنجاب کیرالہ اور دوسرے صوبوں میں پھیلتی جارہی ہے۔ چونکہ یہ ہر لمحے وسیع تر حصّے پر پھیل رہی ہے اس لیے یہ ضرور پورے بھارت میں پھیل جائے گی۔

مغربی بنگال کی مسلّح جدوجہد جو ستمبر ۱۹۶۹ء میں شروع ہوئی تھی وہ اب صوبہ کے تمام ضلعوں میں پھیل گئی ہے۔ پنجاب میں مسلح جدوجہد کا آغاز ۱۹۶۸ء میں ہوا۔ بھٹنڈا ضلع کے دو گاؤں بھیکھی اور سماؤن کے کسانوں نے سب سے پہلے اپنی بیداری کا ثبوت دیا۔ اس وقت سے اب تک انقلابی کسانوں کی جدوجہد نے روپار، سنگرور، ہوشیار پور وغیرہ ضلعوں میں بڑی وسعت پائی ہے۔ آج اس صوبہ کے گیارہ ضلعے اس کی زد میں ہیں۔ کیرالا میں کسان گوریلوں نے فروری ۷۰ ۱۹ میں کینانور ضلع میں اپنے حملے کا آغاز لیا۔ اسی سال جولائی کے آخر میں کیرالا کے کوٹایام اور پلگھٹ ضلعوں میں بھی کسان گوریلوں نے اپنی جدوجہد شروع کی۔ جس نے رجعت پرست برسرِ اقتدار طبقہ کو لوکھلا دیا۔

انقلابی کمیٹیاں

گزشتہ سال بھارت کے کسانوں کی مسلّح جدوجہد میں مزید تیزی پیدا ہوگئی۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کھیت مزدور اور غریب کسان گوریلوں کے ایک گروپ نے مغربی بنگال کے پورنیا ضلع میں کشانگنج کے مقام پر (نکسل باڑی علاقہ سے متصل) ایک پولیس اڈے پر حملہ کیا۔ انہوں نے ایک ظالم و جابر افسر کو ٹھکانے لگا کر چھ رائفلوں پر قبضہ کرلیا اس کے بعد سے مغربی بنگال کے لوگوں نے بندوقیں اور رائفلیں چھین چھین کر عوامی سپاہِ آزادی کو مسلّح کرنا شروع کردیا۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر انقلابی کمیٹیاں بھی بنائی ہیں صرف نکسل باڑی علاقوں میں اس قسم کی نو کمیٹیاں موجود ہیں۔

ان انقلابی کمیٹیوں نے نفرت انگیز قاتل زمینداروں کی زمینیں ضبط کرکے ہاریوں اور غریب کسانوں میں تقسیم کردیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مالگزاری کم کرانے کی پالیسی پر بھی عملدرآمد کرنا شروع کردیا۔ آج پورے مغربی بنگال میں مسلح جدوجہد بہت بڑے پیمانے پر عوامی تحریکوں کی صورت اختیار کرگئی ہے جو زمینداروں کی زمینیں اور غلّوں پر قبضہ کرلیتی ہے۔ انقلابی کمیٹیوں کی قیادت میں ان علاقوں کے مظلوم عوام نے فوجی تنظیمیں بنالی ہیں تاکہ انقلابی طاقت کا تحفظ کیا جاسکے اور یہ بتدریج عوامی جنگ کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔

نشانہ ـــــ مٹھی بھر عوام

مقامی ظالموں، شرانگیز "شرفا" طاقت کے نشہ میں بدمست زمیندار اور وہ لوگ جو عوام کا قتلِ عام کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ جو غداری اور مخبری کرکے انقلابی کارکنوں کا سودا کرتے ہیں ـــــ یہی وُہ لوگ ہیں جو خصوصاً کسانوں کی جدوجہد کا نشانہ ہیں۔

ذیل میں چند واقعات درج کیے جاتے ہیں:-

۱۰ر اپریل ۱۹۷۰ء رات کے ایک بجے تیرہ کسان گوریلوں نے کینانور ضلع کے مقام چیروکنّو پر ایک جابر زمیندار کرشنن نمبیار کو ٹھکانے لگا دیا۔ یہ شخص کسانوں اور ان کی عورتوں پر ظلم و تشدّد کرنے میں پیش پیش رہتا تھا۔ گرچہ اس کا مکان آہنی دروازوں اور اونچی اونچی دیواروں سے کسی قلعہ کی طرح محفوظ تھا مگر بہادر اور پُرعزم گوریلے ان دروازوں کو توڑ کر اندر داخل ہوگئے اور اس درندہ صفت جاگیردار کا خاتمہ کردیا۔ اس علاقہ کے کسانوں نے اپنے ساتھیوں کی دلیری پر انہیں خوب خوب مبارک باد دی۔

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

احوالِ واقعی

وزارت سے قیوم خان کی سبکدوشی کا امکان







پیپلز پارٹی، نیپ اور جمعیت کا سمجھوتہ

واقفِ حال

آج کی خبر ہے کہ صدر بھٹو۔ صوبہ سرحد کے گورنر ارباب سکندر خلیل۔ وزیر اعلیٰ مفتی محمود۔ صوبہ بلوچستان کے گورنر میر غوث بخش بزنجو۔ وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل۔ نیپ کے سربراہ ولی خان مرکزی وزیر جناب شیرپاؤ اور عبدالحفیظ پیرزادہ کے درمیان بات چیت ہوئی وہ کامیاب ہوئی اور بعض باتوں پر اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ جن میں مرکز اور صوبوں میں مخلوط حکومتوں کے قیام کا امکان بھی شامل ہے۔ ممکن ہے جب آپ ان سطور کو پڑھ رہے ہوں۔ اس وقت تک اس نئے معاہدے کی تفصیلات بھی سامنے آ چکی ہوں۔

پہلے ایک معاہدہ جو کئی دن کے سوچ بچار کے بعد طے ہوا تھا اس کی تاویلات میں اختلاف پیدا ہونے کے سبب جلد ہی ٹوٹ گیا تھا۔

بعد میں مرکز میں برسر اقتدار پارٹی نے سرحد اور بلوچستان میں مخلوط پارٹیوں کو حکومت بنانے کی دعوت دی اور گورنر بھی سیاسی پارٹیوں کے مقرر کر دیئے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نیپ کے زہر کے تریاق کے طور پر قیوم خان کو وزارت داخلہ دی گئی۔ یہ وزارت داخلہ اور سیاسی گورنروں کا تقرر بہرحال ایک نئے سیاسی تصادم کا پیش خیمہ بننا تھا اور وہ بنا۔ گورنر اور وزارت داخلہ کا آپس میں گہرا ربط ہونا چاہیئے۔ لیکن سیاسی گورنر اور وزارت داخلہ آپس میں متصادم رہے۔ گورنر وزیر داخلہ کو دھمکیاں دیتے تھے۔ وزیر داخلہ گورنر کو۔ یوم بابڑہ منانے سے یہ اختلافات اور کشیدہ ہو گئے۔ بابڑہ فائرنگ اس وقت ہوئی تھی جب قیوم خان سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ دردمند اور محب وطن حلقوں میں بابڑہ فائرنگ کی ہمیشہ مذمت کی گئی۔ اب نیپ یہ دن منا کر قیوم خان سے سیاسی انتقام لینا چاہتی تھی۔ یوم بابڑہ سے تیسرے روز مرکزی وزیر داخلہ سمیت تین مرکزی وزیروں نے پشاور میں بڑی سخت تقریریں کیں اور نیپ کو دھمکیاں دیں۔ اس سے پہلے مرکزی وزیر اطلاعات پشاور میں یہاں تک کہہ گئے کہ ہم چاہیں تو آج سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں ختم کی جا سکتی ہیں۔

یہ اختلافات کشیدہ ہو رہے تھے۔ اسی اثناء میں لندن ٹائمز کو دیا ہوا ولی خان کا انٹرویو بھی شائع ہو گیا۔ جس میں انہوں نے صدر بھٹو کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ذمہ داری میں پھر شریک ٹھہرایا تھا۔ مرکز پر مختلف الزامات لگائے تھے۔ "دی سپیگل" جرمنی کو دیا ہوا انٹرویو اور بھی خطرناک ہے۔ ولی خان بیرون ملک نہ جانے کیوں صدر بھٹو سے اپنے مقابلہ کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے اپنے بعض بیرونی آقاؤں کو خوش رکھنے کے لئے یہ ضروری امر ہو۔ ورنہ اسلام آباد میں ان کا رویہ بالکل نرم ہوتا ہے۔

نیپ اور پیپلز پارٹی کے درمیان بڑھتی ہوئی یہ کشیدگی تشویش ناک ہو رہی تھی۔ اس میں ایک امر یہ بھی تھا کہ گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کی اب تک جتنی کانفرنسیں ہوئیں۔ اس میں بلوچستان کے وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل شریک نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے شملہ جانے سے بھی انکار کیا تھا۔ بلوچستان اور سرحد دونوں مرکزی حکومت اور بالخصوص وزیر داخلہ اور ان کی پارٹی پر یہ الزام عائد کرتے رہے کہ ہمارے صوبوں میں جو گڑبڑ ہو رہی ہے وہ وزیر داخلہ کروا رہے ہیں۔

اب کے مینگل صاحب کے راولپنڈی جانے کی خبر آئی تو یہی خیال ہوا تھا کہ اب کوئی انتہائی سنجیدہ مسئلہ زیر غور آنے والا ہے کہ مینگل صاحب بھی تکلیف کر رہے ہیں۔

نیپ کی حکومت بننے سے لے کر اب تک جتنے واقعات ہوئے ہیں۔ ان میں بین الاقوامی طور پر معاہدہ شملہ اور اندرونی طور پر سندھ میں لسانی فسادات کا مسئلہ سرفہرست ہے۔ سندھ میں صوبہ سرحد نے ایک سرکاری وفد بھی بھیجا تھا۔ جو خاصی تفصیلات جان کر گیا ہے اور مناسب وقت پر شائع کریں گے۔ حکومت سندھ نے نیپ کے کئی رہنماؤں کو ان فسادات کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔

اس سارے عرصے میں نیپ اور پیپلز پارٹی ایک دوسرے کے خلاف سخت سے سخت زبان استعمال کرتے رہے ہیں۔ ان میں صرف میر غوث بخش بزنجو تھے جنہوں نے وقتاً فوقتاً اس کیلئے آواز بلند کی کہ اگر پاکستان کو محفوظ رکھنا ہے تو نیپ اور پیپلز پارٹی کے درمیان تعاون ہونا چاہیئے۔ سخت تقریروں اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

جناب بزنجو ایک صلح کل قسم کے سیاست دان ہیں۔ پہلے بھی نیپ جمعیت کی مخلوط پارٹی اور برسراقتدار حکومت کے درمیان بات چیت کو کامیابی تک پہنچانے میں بزنجو صاحب کا ہی کمال ہے۔ حکومت ایران سے بھی انہوں نے صدر بھٹو کے ایما، پر ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں سمجھوتے کئے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ نیپ اور جمعیت نے وزیر داخلہ قیوم خان پر بڑے الزامات لگائے ہیں اور مطالبہ کیا ہے کہ انہیں اس عہدے سے برطرف کیا جائے۔ تو ملک میں امن وامان قائم ہو جائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ صدر بھٹو۔ اگر اس بات سے متفق ہو جاتے ہیں تو خان قیوم کو وزارت سے الگ کر کے کہاں بھیجیں گے اور ان کی جگہ کیا اپنی پارٹی سے کسی کو لیں گے یا دوسری پارٹیوں میں سے کسی کو یہ عہدہ تفویض کریں گے۔

نیپ اور پیپلز پارٹی میں اختلاف بے شمار ہیں۔ بنیادی اصولوں پر ان کا سمجھوتہ نہیں ہے۔ بین الاقوامی مجبوریوں کی بنا پر نیپ کی اقلیتی اکثریت کو حکومت مل گئی ہے ورنہ ان کی اکثریت جمیعت العلماء کے بغیر نہیں بن رہی ہے۔

اس معاہدے کے بھی زیادہ دیر چلنے کا امکان نہیں ہے۔ البتہ مرکز میں نیپ اور جمیعت کی شمولیت اور ادھر صوبائی وزارتوں میں پیپلز پارٹی کی شمولیت سے نیپ اور پیپلز پارٹی کے جھگڑے مرکزی کابینہ اور صوبے کی وزارتوں میں سمٹ کر رہ جائیں گے عوام ان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ اگر پیپلز پارٹی نے تدبر کا مظاہرہ کیا تو اس طرح نیپ کا اپوزیشن رنگ ختم کیا جاسکتا

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

کھیل

اسلام کی تبلیغ نہیں، پیسے کا معاملہ ہے

محمد علی کلے نے پاکستان آنے کا

اڑھائی لاکھ ڈالر معاوضہ طلب کیا

الفتح رپورٹ

- محمد علی کا دورۂ پاکستان اسلامی اخوت کے اٹوٹ رشتے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
- یہ میری نہیں میرے ایمان کی فتح ہے۔
- وہ سعودی عرب میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
- پاکستان میں کروڑوں آنکھیں محمد علی کے استقبال کے لئے فرش راہ ہیں۔

یہ ایک اخبار کے مضمون کی چند سرخیاں ہیں جو باکسنگ کے سابق چمپئین محمد علی کلے کے متوقع دورۂ پاکستان کے سلسلہ میں شائع کیا گیا۔ کلے ۲۲ اگست کو پاکستان میں متوقع تھے، مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت نے اُن کے استقبال کے لئے استقبالیہ کمیٹیاں تشکیل دی تھیں۔ تمام انتظامات مکمل تھے لیکن محمد علی پاکستان نہیں آئے۔ انہوں نے یہ دورہ منسوخ کر دیا۔ کیوں؟ درحقیقت ان کا دورہ پاکستان اسلامی اخوت کے لیے تھا اور نہ ہی اسلام کی سربلندی کے لئے، بلکہ سیدھا سادا اقتصادی دورہ تھا۔ مقصد روپیہ کمانا تھا۔ وہی مقصد جو ایک پیشہ ور باکسر کا ہوتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ دورۂ پاکستان کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے محمد علی کلے نے اپنا ایک نمائندہ پاکستان بھیجا۔ اس نے حکومت پاکستان سے گفت وشنید کی۔ اور بتایا کہ "محمد علی کلے اپنے دورے کا معاوضہ ۲ لاکھ ۵۵ ہزار ڈالر لے گا۔" پاکستانی حکام نے اقتصادی مجبوریاں بتائیں۔ زرمبادلہ کی قلت کا رونا رویا۔ معاوضہ میں کمی کرنے کے لئے کہا گیا۔ لیکن کلے کے نمائندے نے صاف انکار کر دیا۔ معاملہ بگڑتا دیکھ کر پاکستانی حکام نے کہا کہ "ہمارے پاس اتنا زرمبادلہ نہیں ہے۔ ہم صرف ۵۵ ہزار ڈالر سرکاری طور پر دے سکتے ہیں۔ باقی دو لاکھ ڈالر اپنے شیڈولڈ بنکوں کی دوسرے ممالک میں موجود شاخوں سے باہر ہی دلوانے کا انتظام کر دیں گے۔"

محمد علی کلے کا نمائندہ اس بات پر رضامند ہو گیا اور دورہ کا پروگرام مرتب کر کے چلا گیا۔ اُس نے امریکہ جا کر کلے کو پوری تفصیلات سے آگاہ کیا۔ کلے نے یہ سُن کر حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ "مجھے یہ شرائط منظور نہیں، لیکن دو لاکھ ڈالر شیڈولڈ بنکوں کی شاخوں سے پہلے دلوا دیں تو میں پاکستان آجاتا ہوں۔" لیکن پاکستانی شیڈولڈ بنکوں نے اتنی کثیر رقم دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور یہ موقف اختیار کیا کہ ہمارے پاس اتنا فالتو زرمبادلہ نہیں ہے۔ جب کلے کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے دورہ منسوخ کر دیا اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

کلے اٹھتے بیٹھتے اسلام کا نام لیتے ہیں، سعودی عرب میں مستقل رہائش اختیار کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ اسلام کا شیدائی ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ اور یہ دعوے بھی ہے کہ میں نے امریکہ میں اسلامی تحریک چلائی ہے۔ اُس کے لئے کام کرتا ہوں۔ باکسنگ سے ریٹائر ہونے کے بعد ہمہ وقت اسلام کی تبلیغ کروں گا۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ لیکن دوسرا رُخ جو عملی بھی ہے وہ یہ کہ کلے پاکستان .... سب سے بڑی اسلامی ریاست کا دورہ کرنے کا معاوضہ ۲ لاکھ ۵۵ ہزار امریکی ڈالر طلب کرتے ہیں، حالانکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ پاکستان سنگین معاشی بحران میں مبتلا ہے۔ زرمبادلہ کا قحط ہے انہیں یہ بھی علم ہے کہ اُن کے دورے کا معاوضہ وڈیروں اور سرمایہ داروں کی جیب سے ادا نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ مسلمان محنت کش عوام، مزدوروں اور کسانوں سے ٹیکس کی صورت میں لیا جائے گا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کا اصرار ہے کہ میں اپنے معاوضہ میں کمی نہیں کروں گا۔ اگر اتنا معاوضہ دے سکتے ہو تو بلواؤ۔

اگر محمد علی محض باکسر ہوتے اور اسلام کا مقدس لیبل نہ لگائے ہوتے تو ہمیں معاوضہ طلب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ یہ ان کا ذریعہ معاش ہوتا، لیکن کلے خود کو اسلام کا چمپئین اور شیدائی کہتے ہیں۔ پاکستانی سرمایہ داروں کے اخبارات اُسے عظیم جبل اسلام قرار دیتے ہیں۔ اس کے دورۂ پاکستان کو اسلامی اخوت کا اٹوٹ رشتہ بتایا جاتا ہے۔ کیا یہی اسلامی اخوت کا اٹوٹ رشتہ ہے جس کا مظاہرہ محمد علی کلے نے پورا معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں کیا ہے۔

الفتح



"میری پاک دامنی میرے لئے بوجھ بن گئی"



امریکہ کے صرف ایک شہر میں

چار ہزار گیارہ سو بن بیاہی دلہنیں

نعیم آروی

امریکہ کی نئی نسل میں "جنسی آزادی" معاشرے کی دیمک زدہ پابندیوں کو توڑ کر چھوت کی بیماری کی طرح تیزی سے پھیل رہی ہے ——!

شیلا فلائی ین جے ہائی سکول کی گریجویٹ طالبہ ہیں جس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال ہے، خاندان کی پابندیوں اور والدین کے وقار کو ٹھوکر مار کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اپنے کنوارے پن کا بوجھ سر سے اتار پھینکنے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور اپنے والدین کو سمجھانے کے لیے گھر میں ایک خط چھوڑ گئی۔

لڑکیوں کو جنسی لذت حاصل کرنے کا اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا لڑکوں کو۔ دو سال کے دوران میں تقریباً نو لڑکوں کے ساتھ جسم و جان کی لذت سے آشنا ہو چکی ہوں۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک بے حد خوبصورت اور بے حد بلند چیز جس کا تجربہ بار بار کرنے میں بے پناہ مسرتوں اور لذتوں کا احساس دمک اٹھتا ہے۔

شیمر کالج، ماؤنٹ کیرول III کی ایک سولہ سالہ طالبہ ایمیڈا نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

"میں ابھی تک پاک دامن ہوں۔ حالانکہ ابھی سے میرے اندر یہ شدید خواہش مچلتی ہے کہ کوئی نوجوان لڑکا میری پاک دامنی کو جذبے اور بھرپور انداز سے تار تار کر دے۔ اور مجھے اٹھا کر فرش سے عرش پر پہنچا دے۔ چونکہ میں کیمپس کی سب سے نوعمر لڑکی ہوں اس لیے لڑکے مجھے نظر انداز کر کے مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں ابھی اس لائق نہیں ہوں۔ مجھ پر میرے والد کا گہرا اثر ہے۔ لیکن درحقیقت وہ وزیر ہونے کے باوجود اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ سیکس کے خلاف کلیسا کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے وہ دن قریب ہے، جب ہم جنس کے معاملے میں ہر قسم کی پابندیوں سے مطلق آزاد ہوں گے ——!"

سوئے فرینکلن جس کی عمر اس وقت ۲۵ سال ہے اپنا جنسی تجربہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:-

میں مغربی دنیا کے متوسط طبقے کے ایک روایت پرست خاندان سے تعلق رکھتی ہوں ۱۹۶۵ء میں میری عمر اٹھارہ سال تھی، کالج کی لڑکیاں اپنی قریب ترین سہیلیوں سے جنس کے بارے میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ عام طور

پر ان لڑکیوں کا تذکرہ ضرور ہوتا جن کے بارے میں یہ شک تھا کہ ان کے تعلقات کسی نہ کسی لڑکے سے استوار ہیں۔ میرے لیے پاک دامنی بڑی اہم چیز تھی۔ ایک دن میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ لان میں چہل قدمی کر رہی تھی، اچانک اس نے مجھے الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا ——— "یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے۔ میرے ساتھ رات گزارو، بصورتِ دیگر میں تمہیں خدا حافظ کہنے کے لیے تیار ہوں!"

سوئے کا بیان ہے کہ وہ اپنے محبوب کے اس الٹی میٹم کو برداشت نہ کر سکی۔ اور تھوڑی سی ردّ و کد کے بعد اسے بالآخر اپنا سر جھکانا پڑا۔ وہ اپنے تجربے کو یوں بیان کرتی ہے:

"مائی گاڈ ..... میں نے کیا کیا؟"

جوں جوں میں سیکس کا تجربہ کرتی گئی۔ نئی نئی لذتوں سے ہمکنار ہوتی گئی۔ میں اب تک دنیا کی کیف آگیں لذّت سے کیوں دور رہی، اب تک انسانی جذبات کے حسین ترین پہلو سے کیوں ناآشنا رہی۔"

سوئے کی بہن پیٹ نے پندرہ سال کی عمر میں اپنے سر سے کنوارے پن کا بوجھ اتار پھینکا۔ اسے صرف اس بات کا خوف تھا کہ کہیں وہ حاملہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی بڑی بہن سوئے کی وساطت سے ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ اور حفاظتی راہ اختیار کی۔ سوئے کا کہنا ہے کہ سیکس کے معاملے میں اس کی بہن پیٹ غیر معمولی صحت مندی اور توانائی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس میں جھجک برائے نام بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے بوائے فرینڈوں سے زیادہ کھلی ہوئی ہے۔ اور جنس کے موضوع پر بے تکان بحث و مباحثہ کی عادی ہے۔ مگر ایک خاص بات اس میں موجود ہے۔ وہ سیکس کو اہمیت نہیں دیتی۔ جنسی حظ اٹھانا اس کے لیے ڈنر کھانا ہے۔ اس خوبی کے سبب لڑکے اسے ایکسپلائٹ نہیں کرتے۔"

سیمی اور امینڈا جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ دونوں ۱۹۷۲ء کے امریکہ کی نئی نسل کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سیمی اور امینڈا ایسی لاکھوں لڑکیوں کے والدین کے لیے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔ تیرہ سے انیس برس کے درمیانی عمر کی لڑکیاں اور لڑکے امریکہ کی موجودہ جنسی آزادی سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اس میدان میں لامحدود جنسی لائسنس حاصل کرنے کی آگ میں سُلگ رہے ہیں تباہی کا یہ راستہ سرمایہ پرستی کے طوفان سے نکلا ہے اور اب منہ کھولے مشرق کی جانب بھی بڑھ آیا ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے ماہرِ نفسیات نے اس بات کی رپورٹ کی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم لڑکے اور لڑکیوں کی بڑی تعداد ان سے جنسی مشورہ لینے آتی ہے ان میں سے ایک لڑکی نے کہا ——— "میری پاکدامنی میرے لیے بوجھ بن چکی ہے۔ میں جلد از جلد اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتی ہوں ———!" ایک اور دوسری لڑکی نے بتایا کہ ——— "اس بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے یونان کا دورہ کرنا پڑا جہاں ایک بوڑھے یونانی نے میرے سر سے یہ بوجھ اتار کر مجھے ہلکا کر دیا۔"

امریکی والدین اپنی لڑکیوں کیلئے گھروں میں خلوت گاہیں بنوا رہے ہیں

● امریکہ کی نئی نسل میں دن بدن بڑھتی ہوئی "جنسی آزادی" کے پیش نظر متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے والدین اپنے گھروں میں ایک علیحدہ کمرے کی گنجائش نکالنے پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر جب اُن کی بن بیاہی لڑکیاں اپنے "بوائے فرینڈز" کے ساتھ گھر میں داخل ہوتی ہیں تو اُن کا پہلا اعلان یہی ہوتا ہے۔ "ڈیڈی ہم فلاں کمرے میں سوئیں گے۔ خدا کے لئے ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے"۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ غصیلی قسم کے بوائے فرینڈ خلوت گاہ کا انتظام نہ ہونے کے سبب چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ "کیسا پھکڑ ڈیڈی ہے تمہارا۔ ہمارے لئے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام بھی نہیں کر سکتا۔ بیک ورڈ ہے۔"

● اٹلانٹا پبلک ریلیشن کے ڈائریکٹر نے اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ——— "میں نے اپنے مکان



میں "ڈبل بیڈ" کے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کر لیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں اپنی لڑکی کو اُس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ خلوت گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ ویسے مجھے اپنی لڑکی پر اعتماد



ہے۔ اُس نے مجھے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ شادی سے قبل وہ ایسی کسی حرکت کی مرتکب نہ ہو گی جس سے مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔"

● لاس اینجلس کی ایک خاتون نے جواب دیا۔ "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن اس میں صرف ایک بات کا خطرہ ہے۔ گھر کے اندر اس قسم کی سرگرمیوں سے خاندان کے دوسرے افراد بھی متاثر ہوتے ہیں ———"

● واشنگٹن ڈی سی سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون سے جو ایک عدد البیلی لڑکی کی ماں بھی ہیں۔ سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ "مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ گھر کے اندر میری لڑکی اپنے محبوب کے ساتھ عیش و نشاط کی محفلیں سجائے۔ کیونکہ میں یہ خوب سمجھتی ہوں کہ اگر میں اپنی لڑکی کو اس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کر دوں یا سختی کروں تو وہ کسی دوسری جگہ اپنے جذبات کی تسکین کے لئے نکل کھڑی ہو گی۔"

● واشنگٹن کی ایک خاتون نے کہا کہ "اگر وہ ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے لئے علیحدہ جگہ تلاش کرنی چاہیئے۔"

● شکاگو کی ایک خاتون نے کہا کہ "اس نئی اخلاقی لہر کو میں پسند نہیں کرتی، لیکن مجھے اس کے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔"

امریکہ کی نئی نسل لامحدود جنسی لائسنس حاصل کرنا چاہتی ہے

نکسن حکومت نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں جنسی آزادی کے نام پر جنسی بے راہ روی کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے زبردست بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ اس کی باقاعدہ چھان بین کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے سروے کرنے کے بعد پہلا انکشاف تو یہ کیا کہ صرف ایک شہر میں تقریباً چار ہزار چھ سو گیارہ بِن بیاہی سفید فام اور سیاہ فام لڑکیاں جنسی آزادی کی طلب میں گمراہی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ۴۶ فیصد لڑکیاں ۲۰ سال کی عمر میں اپنا کنوارہ پن کھو بیٹھی ہیں۔ یہ ڈیموگرافر جان ہوپکنز مالوین زہنک اور جان کنٹنگر کی تحقیق ہے۔ اسی طرح ۵۳ء میں جو سروے کیا گیا تھا اس کے مطابق پانچ ہزار چھ سو سفید فام لڑکیوں نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے ہی اپنی عصمت لٹا چکی ہیں۔ اسی طرح ۴۰ فیصد لڑکیاں بیس سال کی عمر میں کنوار پنے سے محروم ہو چکی تھیں۔

نوجوان نسل کے جنسی حقائق کا پتہ اس صورت سے بھی چلتا ہے کہ ہائی اسکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم لڑکے اور لڑکیوں میں جنسی امراض، تیزی سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ آتشک، سوزاک گلے اور دِق کی بیماریاں عام ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں آتشک کے کم و بیش پانچ ہزار مریض ریکارڈ کیے گئے۔ جب کہ ایک لاکھ پچاس ہزار طلباء سوزاک کے مرض میں مبتلا پائے گئے۔ اسی قسم کی متعدی بیماریوں میں مبتلا لڑکیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ بیان کی گئی ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی انکشاف کیا گیا کہ چار میں سے تین لڑکیاں کسی نہ کسی وجہ سے اپنی بیماری کا انکشاف نہیں کرتیں ——— !

امریکہ میں اِن دنوں بن بیاہی حاملہ لڑکیوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی جنسی سرگرمیوں کا دوسرا بڑا ثبوت ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جو سروے رپورٹ تیار کی گئی تھی اس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ناجائز بچوں کی پیدائش کی شرح ۳ء۸ فیصد تھی، جبکہ ۱۹۷۲ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۱ء۸ فیصد ہو گئی۔ ۱۹۷۱ء میں پندرہ لاکھ لڑکیوں کا حمل ضائع کیا گیا

نئی نسل میں جنسی آزادی کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کے پیشِ نظر اسکولوں اور کالجوں میں ٹیلیفون پر "ہاٹ لائن" کے بطورِ خاص انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ شمالی کارولینا یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیاں خفیہ نمبر ۵۵۰۵، ۹۳۳۷ ڈائل کر کے ماہرینِ جنسیات سے جنس کے متعلق معلومات اور ہدایات حاصل کرتی ہیں۔ تقریباً تیس تربیت یافتہ ماہرین ایک ہفتہ میں پچاس کالوں کا جواب دیتے ہیں۔ زیادہ الجھن والے سوالوں کو حل کرنے کے لیے درجن بھر ماہرین اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ دیہی علاقوں میں احتیاطی تدابیر کے متعلق پرائیویٹ سوشل ایجنسیاں اور پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہدایات دی جاتی ہیں نیویارک میں غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیوں کو ضبطِ



تولید کا مشورہ دینے کے لیے باقاعدہ کئی ادارے کھولے گئے ہیں۔ "پلانڈ پیرن ہوڈ" کے نائب صدر الفرڈ مورِن کا کہنا ہے ——— "اگر تم نے داخلے کا ایک ٹکٹ لے لیا ہے یعنی ایک دفعہ حاملہ ہو چکی، ہو تو ہم بخوشی تمہارا تحفظ کریں گے۔"

امریکہ کے ایک ماہرِ اخلاقیات نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ——— "امریکہ جنس اور سرمایہ کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ یہاں کے معاشرے میں جنس اس قدر اہمیت اختیار کر چکی ہے کہ بازار میں ایسی گڑیاں فروخت نہیں ہوتیں جن کی چھاتیاں ابھری ہوئی نہ ہوں۔ لعض ماہرین کا کہنا ہے کہ سیکس پر کلیسا کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ اس سے آزادی حاصل کرنے کی فطری خواہش ایک طوفان کی صورت میں امڈ پڑی جس میں بالآخر نوجوان نسل ڈوبتی جا رہی ہے"

امریکہ بلاشبہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ مگر استحصالی نظام کی کوکھ سے جنم لینے والے معاشرے میں محرومیاں اور مایوسیاں کسی نہ کسی شکل میں انسان کو دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہیں۔ کلیسا کی ظالمانہ گرفت ڈھیلی پڑی تو نوجوان نسل کو سرمایہ پرستی کے عذاب نے گھیر لیا اور وہ راہ گم کردہ مسافر کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے۔ یہ عذاب امریکہ کی نئی نسل نے خود مسلط نہیں کیا بلکہ ان کے پیشرووں نے اِس پر نازل کیا ہے۔ آخر یہ نسل جھنجھلا کر بغاوت کر بیٹھی۔ لیکن اس بغاوت کو اندھی بغاوت ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بغاوت اُسے ایسی کوئی راہ سجھانے میں ناکام رہی ہے جس پر وہ چل کر استحصال سے پاک صاف

اسکولوں اور کالجوں میں جنسی معلومات حاصل کرنے کے لئے خفیہ ٹیلیفون لگا دیئے گئے



اور ستھرے معاشرے کی تشکیل میں اپنا تاریخی کردار ادا کر سکے۔

پاکستان کی نئی نسل کے خلاف سازش

پاکستان کی نئی نسل کو جنسی طور پر بیمار بنانے کے لیے ایک خوفناک منصوبے پر بتدریج اور پیچھے چھپکے عمل کیا جا رہا ہے۔ اس سازش کا جال مغربی کتابوں، مغربی فلموں اور عریاں تصاویر کے ذریعے پھیلایا جا رہا ہے۔ گزشتہ چند ماہ سے کراچی کے بیشتر سینما گھروں میں جنسی فلموں کی نمائش کے رجحان میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے اس قسم کی فلمیں اچھی اور صحت مند موضوع پر مبنی فلموں سے کہیں زیادہ رش لیتی ہیں۔ سیکس کے چند ایک مناظر دیکھنے کے لیے ٹکٹ کی کھڑکیوں پر ہجوم ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ شائقین میں نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی بڑی تعداد شامل ہوتی ہے جو ہیجان انگیز مناظر دیکھنے کے بعد یقیناً امریکہ کی نئی نسل سے مختلف انداز میں نہیں سوچتی ہوگی۔ آخر اس اخلاقی تباہی کا ذمہ دار کون ہوگا ؟

پچھلے دنوں ایک سروے کے مطابق کراچی کے کم و بیش آٹھ سینما گھروں میں جنسی فلموں کی نمائش کا دھوم دھام سے اہتمام کیا گیا۔ اب بھی بیشتر سینما گھروں میں ان میں سے بعض فلموں کی نمائش کامیابی سے جاری ہے۔ اشتہارات میں یہ لکھا جاتا ہے —— "کراچی والے اس فلم کو جانے نہ دیں گے "۔ ایسی فلموں کی کامیابی سے فلمساز، سینما کے مالکان اور ڈسٹری بیوٹروں کو یقیناً زبردست منافع حاصل ہوتا ہوگا لیکن منافع کے اس رجحان کے پیچھے نئی نسل کی تباہی کا جو سامان چھپا ہوا ہے اس پر شاید ہی کسی نے سنجیدگی سے غور کیا ہو۔

گزشتہ دنوں اس بات کا بھی انکشاف ہوا ہے کہ کراچی کے آٹھ نو سینما گھروں میں رات کے بارہ بجے سے ننگی فلموں کا اسپیشل پروگرام ہوتا ہے۔ اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ بڑی بڑی رقمیں صرف کر کے اپنی سیٹیں بُک کرواتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں لمبی لمبی گاڑیاں بڑے پُر اسرار انداز میں شہر اور مضافاتی بستیوں سے ان سینما گھروں کی طرف فراٹے بھرتی —— ہیں جہاں اخلاق سوز فلموں کی غیر قانونی نمائش ہوتی ہے۔ جن سینماؤں میں سنسر شدہ انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں ان میں رش بڑھانے کا یہ طریقہ نکالا گیا ہے کہ ہفتے میں ایک ... سنسر شدہ ریلیں دکھائی جاتی ہیں۔ فلم دیکھ کر باہر نکلنے والے سیٹیاں بجا بجا کر اعلان کرتے ہیں کہ —— "بڑی گرم فلم ہے —— مزا آگیا "۔ یہ جملہ شائقین کے جذبات کی آگ بھڑکانے کے لیے بہت کافی ہوتا ہے۔

اسی طرح بک اسٹالوں کے خفیہ سروے سے پتہ چلا ہے کہ ادھر چند ماہ سے فحش انگریزی کتابوں اور تصاویر کی درآمد کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے ایسی کتابیں ہر کس و ناکس کو نہیں دی جاتیں۔ ان کے حصول کے لیے "کوڈ ورڈ" ہوتے ہیں۔ اِدھر آپ نے چند الفاظ ادا کیے۔ اِدھر بک سیلر چپکے سے آپ کے ہاتھوں میں کاغذوں میں لپٹا ہوا ایک بنڈل تھما دے گا۔

اگر پاکستان میں نئی نسل کو گمراہ کرنے کا یہ سلسلہ کسی روک ٹوک کے بغیر مزید کچھ عرصہ جاری رہا تو پورے ملک میں جنسی بے راہ روی کا ایک ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا جس کے آگے بند باندھنا ہمارے جیسے غریب اور پسماندہ ملک کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔

صفدر سلیم سیّال

غزل

ہم پر بھی عاشقانِ سحر شام ہو گئی
لیکن عدو کی چال بھی ناکام ہو گئی

لیتی تھی جھینپ کر جو مرا نام زیرِ لب
لڑکی سہیلیوں میں وہ بدنام ہو گئی

اُس بے وفا کا جسم بِکا سارے شہر میں
عزّت ہماری مفت میں نیلام ہو گئی

جس پر فدا تھے شہر کے سرمایہ دار کل
وہ ذات آج داخلِ دشنام ہو گئی

بے شک زبان کاٹ دو، قلم ہاتھ بھی کرو
لیکن جنوں کی رسم تو اب عام ہو گئی

کس کو خبر وہ لوگ پھٹی پو تو کیا ہوئے
مایوس جن سے گردشِ ایام ہو گئی

اُن کو تو گالیاں بھی چھپیں ضابطوں کیساتھ
اک میری چیخ موردِ الزام ہو گئی !

صبح نہیں تو اپنے ہی اجزا بکھیر دے
یہ رات اب تو باعثِ آلام ہو گئی

عراق میں پھانسی پانے والے غدار کے رشتہ داروں کو ڈھائی لاکھ ٹن سیمنٹ دیا گیا

صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے غلاف

ولیکا، سیاستدانوں اور نوکر شاہی کا گٹھ جوڑ

الفتح رپورٹ

ذیل پاک سیمنٹ کے ایکسپورٹ سے حکومت کو ہر سال لاکھوں روپے کا غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوتا تھا۔ لیکن مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے کارپردازوں کی نااہلی اور بے ضابطگی کے سبب فائدہ تو کجا کروڑوں روپے کا زرمبادلہ ضائع ہو گیا۔ پاکستان کی بیوروکریسی جو ۲۵ سال سے ہر شعبۂ زندگی کو مفلوج اور ناکارہ بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہی ہے۔ اس کارپوریشن کو بھی دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ رشوت، سفارش اور اقربا پروری کا یہ عالم ہے کہ بیرونِ ممالک سیمنٹ ایکسپورٹ کرنے کے لئے ملکی ایجنسیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ٹنڈر پالیسیوں کی کھُلی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیمنٹ کی سپلائی کے لئے غیر ملکی ایجنسیوں اور پارٹیوں کو منتخب کیا جاتا ہے، جس سے حکومت کو زرمبادلہ کی صورت میں لاکھوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ سیمنٹ کی بزنس کرنے والے قریبی حلقوں نے اس دھاندلی کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے چند اعلیٰ احکام جس میں ایک سابق چیئرمین بھی شامل ہیں۔ غیر ملکی پارٹیوں سے خفیہ سمجھوتہ کر کے خود تو لاکھوں روپے سمیٹ لیتے ہیں۔ مگر دوسری طرف حکومت کو مسلسل لاکھوں روپے کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان اعلیٰ افسروں کی رسائی چونکہ اوپر تک ہے۔ لہٰذا ان کے خلاف لب کشائی کی جرأت کسی میں نہیں ہوتی۔ ملک و قوم کو تباہ کرنے کا یہ کھیل ایک عرصہ سے جاری ہے۔

پاکستان سیمنٹ ایکسپورٹ کارپوریشن لمیٹڈ ذیل پاک سیمنٹ ایکسپورٹ کرنے والی ایک بڑی کارپوریشن ہے، جس نے ماضی میں صرف دس ماہ کے قلیل عرصے میں دو لاکھ ٹن سیمنٹ ایکسپورٹ کیا۔ جس کی مالیت تقریباً دو کروڑ روپے ہوتی ہے۔ اس کارپوریشن کے منیجنگ ڈائریکٹر نے انکشاف کیا کہ اُس وقت ڈبلیو پی آئی ڈی سی (مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن) ایک غیر ملکی پارٹی کو لریج کو ۹۰ شلنگ ۹ پنس فی میٹرک ٹن سیمنٹ فروخت کرتی تھی لیکن پاکستان سیمنٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کو جو ایک مقامی پارٹی تھی اُسے ۱۰۰/- شلنگ فی میٹرک ٹن کے حساب سے سیمنٹ دیا گیا۔ قیمت میں اس فرق اور دوسری مشکلات کے باوجود پاکستان ایجنسی نے ۵۰ ہزار میٹرک ٹن سیمنٹ کی سپلائی کا آرڈر دیا۔ صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے بدعنوان افسروں پر بجلی گر پڑی۔ چنانچہ انہوں نے پاکستانی ایجنسی کی حوصلہ شکنی کے لئے فی میٹرک ٹن کی قیمت میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور ۱۰۱ شلنگ ۵ پنس کے حساب سے فروخت کیا گیا۔ پاکستان سیمنٹ کارپوریشن نے ۳۰ ہزار میٹرک ٹن سیمنٹ فروخت کرنے کے بعد صنعتی ترقیاتی کارپوریشن سے مزید ۵۰ ہزار میٹرک ٹن سیمنٹ کی سپلائی کی درخواست دی کیونکہ اس نے ایک غیر ملکی پارٹی سے مطلوبہ مقدار میں سیمنٹ فروخت کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ جس سے حکومت کو لاکھوں روپے کا زرمبادلہ حاصل ہوتا۔ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کی نوکر شاہی یہ بات برداشت نہ کر سکی کہ ایک پاکستانی ایجنسی اسے اس میدان میں پچھاڑ کر اس کی نااہلی اور بے ضابطگی کو ظاہر کر دے۔ چنانچہ مطلوبہ آرڈر کینسل کر کے صرف ۱۰ ہزار میٹرک ٹن سیمنٹ ۱۰۵ شلنگ ۲ پنس کے حساب سے دینے کے احکامات صادر کئے گئے۔ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کی سُستی اور دھاندلی کی وجہ سے غیر ملکی پارٹی کی ایل سی کی مدت استعمال کے بغیر گزر گئی جس سے حکومت کو غیر ملکی زرمبادلہ کی صورت میں تقریباً دو لاکھ پاؤنڈ اسٹرلنگ کا نقصان ہوا۔

دوسری بے ضابطگی

ڈبلیو پی آئی ڈی سی نے پاکستانی ایکسپورٹروں کو نظر انداز کر کے دوبئی کی ایک نئی اور ناتجربہ کار غیر ملکی پارٹی ایم ایس نرولاتی کے ساتھ جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۹۲/- شلنگ کے حساب سے ۴۰ ہزار میٹرک ٹن سپلائی کیا۔ اس غیر ملکی پارٹی کے ساتھ جو کنٹریکٹ کیا گیا وہ کارپوریشن کے اپنے قواعد و ضوابط سے کہیں نرم تھا۔ اس کے برعکس مقامی ایجنسیاں زیادہ ریٹ پر سیمنٹ خریدنے پر آمادہ تھیں مگر اُن کے ٹنڈروں کو مسترد کر دیا گیا۔ اس طرح ملک کو تقریباً ۵۱ ہزار اسٹرلنگ پاؤنڈ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی دوران کویت کی ایک دوسری غیر ملکی ایجنسی میسرز علیلے عبداللہ ال عثمان کو ۹۳ شلنگ کے حساب سے سیمنٹ دیا گیا۔ جبکہ مقامی ایجنسیاں ۱۰۰ شلنگ اور ۱۰۵ شلنگ فی میٹرک ٹن کے نرخ پر سیمنٹ خریدنے کے لئے تیار تھیں۔ اس طرح ملک کو ۳۵ لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان دونوں غیر ملکی ایجنسیوں کو ٹنڈر پالیسی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیمنٹ دیا گیا۔ کیونکہ مقامی ایجنسیاں غیر ملکی پارٹیوں کے مقابلے میں زیادہ ریٹ پر سیمنٹ کی خریداری پر تیار تھیں۔

پاکستان سیمنٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے منیجنگ ڈائریکٹر سید

کارپوریشن کے اعلیٰ افسر کی بے ضابطگی۔ حکومت کو کروڑوں روپے کا نقصان

وصی الدین احمد نے مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے ڈائریکٹر پر مبینہ طور پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ ابتداء سے ان کی ایجنسی کے خلاف ہیں اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح ہماری ایجنسی کو نقصان پہنچایا جائے۔ جب کہ ہماری کارپوریشن نے چھ ماہ کی مدت میں ۸۰ ہزار میٹرک ٹن سے زیادہ سیمنٹ فروخت کر کے غیر ملکی پارٹیوں سے تقریباً ۸۰ لاکھ روپے حاصل کئے۔ ہمارے مقابلے میں غیر ملکی ایجنسیوں کو ترجیح دی گئی اور انہیں کم ریٹ پر سیمنٹ دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی الزام عائد کیا کہ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے مذکورہ ڈائریکٹر نے ہماری حوصلہ شکنی کے لئے غیر ملکی خریداروں میں یہ افواہ پھیلائی کہ ہماری ایجنسی سیمنٹ کی مزید فروخت میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی اور آئندہ سے ڈبلیو پی آئی ڈی سی غیر ملکی پارٹیوں کو براہِ راست سیمنٹ فروخت کرے گی۔ مسٹر خلجی نے ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی بھی ختم نہ کی بلکہ ہمارے فنڈ کو بھی منجمد کرا لیا۔"

کویت اور دوبئی کی غیر ملکی ایجنسیوں کو کم ریٹ پر سیمنٹ دینے کا پُراسرار سلسلہ

۱۹۶۹ء میں پاکستان سیمنٹ ایکسپورٹ کارپوریشن نے مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن سے -/۲۴۵ شلنگ فی ٹن کے حساب سے تین ہزار میٹرک ٹن سفید سیمنٹ خریدا، لیکن سفید سیمنٹ بین الاقوامی معیار سے کم درجے کا ثابت ہوا۔ غیر ملکی پارٹی نے سیمنٹ کے خراب معیار کی شکایت کی اور سیمنٹ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح غیر ملکی پارٹی کو بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی طرح مقامی ایجنسی کے ساتھ پاکستان کے وقار کو بھی دھکا پہنچایا گیا۔ مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے اس شکایت کے پیش نظر وائٹ سیمنٹ کا معیار بہتر کر لیا۔ اس کے باوجود کوئی غیر پارٹی وائٹ سیمنٹ خریدنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کارپوریشن کی بدعنوانی، بے ضابطگی اور نااہلی کی تمام تر ذمہ داری ڈائریکٹر الف کے خلجی پر عاید ہوتی ہے۔ جن کی پشت پناہی دلیکا جیسے چند سرمایہ دار اور شکست خوردہ سیاست دان کر رہے ہیں، جن کا مقصد کارپوریشن کی کارکردگی کو اس حد تک متاثر کرنا ہے کہ یہ ادارہ ناکارہ بن جائے اور بالآخر اسے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے ہاتھوں میں سونپ دیا جائے۔

۱۹۷۱ء میں دوبارہ ٹنڈر پالیسی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسٹر خلجی نے کارپوریشن کے سابق چیئرمین مسٹر علی زئی کے ایماء پر غیر ملکی پارٹی ایم۔ ایس زردانی کو ½۲ لاکھ ٹن سیمنٹ سپلائی کرنے کے احکامات صادر کئے، حالانکہ یہ پارٹی اس سے قبل چھ ماہ کی مدت میں ۳۰ ہزار ٹن سیمنٹ فروخت کرنے میں ناکام ثابت ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک دوسری غیر ملکی کمپنی میسرز گوکل ایکسپورٹ کارپوریشن کو بھی ½۲ لاکھ ٹن سیمنٹ دیا گیا جو لندن میں ڈئیر فیلڈ کے نام سے کاروبار کرتی ہے۔ یہ اپنا سارا منافع لندن منتقل کرتی ہے اس کمپنی کے مالکان کا ایک رشتہ دار بھیا بھائی گوکل بھی تھا جسے سازش کے الزام میں عراق میں پھانسی دی گئی۔ عرب ممالک میں اُن کے نام بلیک لسٹنڈ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ عرب ممالک میں لندن کے فرم کے حوالے سے بزنس کرتے ہیں اور غیر ملکی زرِ مبادلہ باہر رکھتے ہیں۔ مذکورہ بالا حقائق سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ مخصوص مفادات کی خاطر غیر ملکی پارٹیوں کو مقامی پارٹیوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

۲۔ ٹنڈر پالیسی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر ملکی پارٹیوں کو کم ریٹ پر سیمنٹ دیا جاتا ہے۔ غیر ملکی پارٹیاں ڈبلیو پی آئی ڈی سی کو کم منافع دیتی ہیں۔ جب کہ مقامی پارٹیاں زیادہ منافع دیتی ہیں پھر بھی انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

۳۔ مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے حکومت کو اب تک کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔

۴۔ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے بعض اعلیٰ عہدے داروں کے رویے سے کارپوریشن کی ساکھ کو نقصان پہنچا اور کروڑوں روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔

پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن ایک قومی ادارہ ہے نوکر شاہی کو اس بات کی اجازت نہیں ملنی چاہیئے کہ وہ اپنے مخصوص مفادات کے لئے اس ادارہ کو استعمال کرے اور اسے بے ضابطگی یا بدعنوانی کا اکھاڑہ بنائے۔ پاکستان سیمنٹ ایکسپورٹ کارپوریشن نے ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے ایک اعلیٰ عہدے دار پر بے ضابطگی کا الزام عائد کیا ہے۔ اور اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ آئندہ سے سیمنٹ کی فروخت کے لئے صرف مقامی ایجنسیوں کو ترجیح دی جائے۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں حکومت سے یہ مطالبہ جائز ہوگا کہ وہ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے تمام ریکارڈ چیک کرے۔ منجمد فنڈ بحال کیا جائے۔ سیمنٹ ڈویژن کے تمام معاملات کی چھان بین کی جائے اور مبینہ الزام ثابت ہونے کی صورت میں متعلقہ افراد کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔





• کیا بدنام زمانہ ایوب خان ابھی تک حکمران ہیں؟
• پُراسرار سیاسی سرگرمیوں پر ہزاروں روپے لٹائے گئے

لندن میں ایک نیا لندن پلان تیار کیا جا رہا ہے

اشرف شاد

ایک نیا لندن پلان تیار ہو رہا ہے۔ اس کے سارے پُرانے کردار کچھ اور نئے کرداروں کے ساتھ لندن میں جمع ہیں۔ نام نہاد بنگلہ دیش کے بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمان آپریشن کرانے وہاں گئے ہوتے ہیں۔ ممتاز خان دولتانہ پاکستان کے سفیر نامزد ہو کر پہنچ گئے ہیں۔ یوسف ہارون، محمود ہارون پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ ملک غلام جیلانی جو اس مرتبہ ایک بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں کسی نہ کسی طرح وہ بھی لندن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اکبر بگٹی اور حامد سرفراز ان کا قیام بھی مستقل طور پر لندن میں ہے۔ ان سے مجیب الرحمان کی ملاقاتوں کی خبریں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں نیپ کی نمائندگی ابھی باقی ہے۔ باخبر ذرائع کی اطلاع کے مطابق نیپ جو آج کل شدید اندرونی خلفشار کا شکار ہے نئے لندن پلان کی تیاری کے لئے ہونے والی اس "اعلیٰ سطحی کانفرنس" میں نمائندگی کے لئے جانے والی ہے۔

ملک غلام جیلانی جو آج کل تحریک استقلال کے سیکرٹری جنرل ہیں تازہ ترین حالات کی رپورٹ لے کر لندن پہنچے ہیں۔ کراچی میں قیام کے دوران انہوں نے ایک ہی اہم کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں وہ باقاعدگی سے ریس کھیلتے رہے ہیں اور ریس کورس کمیٹی کے بیان کے مطابق اوسطاً ہر ریس میں ۵ ہزار روپے ہارتے رہے ہیں۔ اس طرح گزشتہ صرف چند ہفتوں میں اپنے چہرے پر ایک شکن لائے بغیر انہوں نے دو تین لاکھ روپے گھوڑوں پر نچھاور کئے ہیں۔ اسی طرح بڑی بیدردی سے کچھ رقم اپنے میٹروپول کے قیام کے دوران یہاں کے سیاسی حلقوں سے پُراسرار سرگوشیوں کے دوران خرچ کی ہے۔ جس میں کچھ حصہ ان اخبار نویسوں کے بھی ہاتھ آیا ہے جو بڑی "انٹرنیشنل" شہرت کے حامل ہیں۔

ملک غلام جیلانی کے بہت قریبی حلقوں نے جو ان دنوں ان کے بہت قریب رہے ہیں اس نئے لندن پلان کی بعض بڑی چونکانے والی تفصیلات بتائی ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق لندن میں جمع ہونے والے یہ تمام پرانے سیاست دان جنہیں بڑے بڑے سرمایہ داروں کی پوری طرح پشت پناہی حاصل ہے دا ے کے سوما ر اور ریٹائرڈ جنرل حبیب اللہ خان بھی آج کل اس پلان کی تیاری میں مدد دینے کے لئے لندن میں موجود ہیں) دسمبر تک موجودہ عوامی حکومت کو تبدیل کرنے کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں۔ ان منصوبہ بندوں کا خیال ہے کہ بدنام زمانہ ایوب خان ابھی تک پاکستان کے قانونی حکمران ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ملک غلام جیلانی کے اس مقدمہ کو بنیاد بنایا ہے جس میں سپریم کورٹ نے یحییٰ خان کو اقتدار کا غاصب قرار دیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ کیونکہ ملک کی سب سے بڑی عدالت یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ یحییٰ خان نے غیر قانونی طور پر ایوب خان سے اقتدار حاصل کیا تھا۔ لہٰذا اس غیر قانونی حکومت کے تمام اقدامات بھی غیر قانونی ہیں اور اس غیر قانونی حکومت سے پہلے جو حکمران تھا۔ وہ ابھی تک اس ملک کا قانونی حکمران ہے لہٰذا یحییٰ خان کی حکومت کے تحت کرائے جانے والے انتخابات کالعدم قرار دے دیئے جائیں۔ اسمبلیاں توڑ دی جائیں اور مسندِ اقتدار دوبارہ ایوب خان کے حوالے کی جائے جو ۱۹۶۴ء کی طرح کے انتخابات کا ڈھونگ رچا کر ملک پر دوبارہ بورژوائی کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار دے سکیں۔

نیا لندن پلان ایوب خان کو برسر اقتدار لانے کا پلان ہے لندن میں اس پلان کے سارے محرک جمع ہو کر اسی پر عمل درآمد کرنے کے منصوبے تیار کر رہے ہیں۔ اس سازش کے سرگرم گذشتہ دنوں کے دو بہت اہم واقعات سے بھی ملتے ہیں۔ ہارون فیملی کے ایک نوجوان جو اب نیپ میں شامل ہیں اور جنہیں ہارون فیملی نے سیاسی افق پر تازہ تازہ ابھارنے کی کوشش کی ہے وہ گزشتہ دنوں گرفتار ہوئے اور ان کے گھر کی تلاشی کے دوران مبینہ طور پر بڑے پیمانے پر اسلحہ برآمد ہوا جس میں ڈائنا مائٹ بھی شامل ہے۔

علی محمود یوسف ہارون کے بھانجے ہیں جو ایک زمانے میں رہوڈیشیا کو اسلحہ فراہم کرنے کے ایک ایکٹ میں ملوث پائے گئے تھے۔

دوسری اطلاع یہ تھی کہ فوج کے چھ افسر برطرف کر دیئے گئے۔

لندن پلان کے یہ کرتا دھرتا یہ حقیقت اچھی طرح جان گئے ہیں کہ سیاسی طور پر پیپلز پارٹی کی حکومت تبدیل نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے چار سال بعد انہیں انتخابات کا مجبوری سہارا لینا پڑے گا۔ یہ لوگ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے عبرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس لئے انہیں معلوم ہے کہ انتخابات ان کا چار سال بعد پھر کیا حشر کریں گے۔ ایک سرمایہ دارانہ معاشرے کی فوج طبقاتی نقطہ نظر سے ہمیشہ بورژوا طبقہ کی محافظ رہی ہے۔ لہٰذا ایوب خان کو دوبارہ تخت نشین کرنے کے لئے لندن کے یہ پلانر ایک بار پھر فوج کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ فوج کے ایک حصّہ کو اپنے منصوبہ میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیں گے۔ اس سلسلے میں فضا بنانی شروع کر دی گئی ہے۔ پنجاب میں حزبِ اختلاف کے جلسے میں ٹکا خان آوے ای آوے کے نعرے اور پھر آج کل دیواروں پر پُراسرار طور پر یہ نعرے درج کر دیئے گئے ہیں کہ "ٹکا خان کو رہا کرو" — عوام میں فوج کے امیج (Image) کو بنانے کی ایک نئی کوشش ہے تاکہ فوج کے ذریعے اگر ایوب خان کو لانے کی یہ کوشش کامیاب ہو جائے تو عوام سے ایک بار پھر تالیاں بجوائی جا سکیں۔

فوج کو لانے کا جواز پیدا کرنے کے لئے ملک میں انارکی پیدا کرنے کی کوششیں شروع دن سے جاری ہیں۔ لسانی ہنگامے کے ذریعے تعصبات کی ایک ایسی فضاء قائم کی گئی ہے کہ منافرت کے اژدھے نے سب کو نگل لیا ہے۔ یہ معاملہ سرد ہونے لگا ہے۔ لہٰذا خبریں آ رہی ہیں کہ جماعت اسلامی، قادیانی اور ختم نبوت کا دبی فساد کرانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ جو ایک زمانے میں لاہور کی مسجدوں میں ٹخنوں ٹخنوں خون کھڑا کر چکا ہے۔ اور جس نے ملک میں مارشل لاء لگانے کی پہلی مرتبہ روایت قائم کی تھی۔ جماعت کے قائم مقام امیر میاں طفیل محمد اپنی ایک تقریر میں یہ کہہ کر بنیاد رکھ چکے ہیں کہ موجودہ حکومت میں قادیانی سب سے زیادہ با اثر ہیں۔

لندن پلان کی اصطلاح نے ایوب خان کے زمانے میں اس وقت زور پکڑا تھا جب کہ مجیب، دولتانہ، ولی خان اور یوسف ہارون بڑے پُراسرار طور پر لندن میں جمع ہوئے تھے۔ اور پھر اخبارات نے لندن پلان کی شہ سرخیوں سے اس ملاقات کا احوال شائع کیا تھا۔ اس کے بعد اب یہ نیا لندن پلان تیار ہو رہا ہے۔ اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

الفتح انکشاف

ہاریوں سے زمین چھین کر سابق وزیر خزانہ عقیلی کو دے دی گئی

نواب شاہ کی چالیس ہزار ایکڑ اراضی چند فوجی افسروں کے تصرف میں

یہ ایک چونکا دینے والی حقیقت ہے کہ ایوب خان نے اپنے سیاہ دورِ اقتدار کی طوالت کے لیے فوجی افسروں بالخصوص جنرلوں اور نوکر شاہی کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے فوجی جاگیرداروں اور سول وڈیروں کے طبقے کو جنم دیا۔ سندھ، بلوچستان اور پنجاب میں بیراجوں کی اراضی، سرحدی علاقے کی زرخیز زمینیں فوجی افسروں اور نوکر شاہی کے کل پرزوں کو الاٹ کی گئی۔ صوبہ سندھ میں صرف ضلع نواب شاہ میں چالیس ہزار ایکڑ زرخیز اراضی چند فوجی افسروں اور سول حکام کو الاٹ کی گئی۔ ضلع ٹھٹھہ میں سینکڑوں ہاریوں کو بے دخل کر کے وہ اراضی سابق وزیر خزانہ مسٹر عقیلی کو عطا کی گئی۔ ضلع خیرپور موضع کرونڈی تحصیل فیض گنج پکہ کے بائیس ہاری خاندانوں کی الاٹ شدہ اراضی پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈالا گیا اور وہ جنرلوں اور کرنلوں کو الاٹ کر دی گئی۔ لاہور کے سرحدی علاقوں میں بہترین اور سونا اگلنے والی زرعی اراضی کا سو مربع میل کا رقبہ چند جنرلوں کو الاٹ کیا گیا جن میں جنرل کیانی، جنرل یحییٰ، جنرل حمید، جنرل خداداد، جنرل موسیٰ اور فیلڈ مارشل ایوب خان سرِفہرست ہیں۔ بعض کرنلوں اور جنرلوں کو گھوڑی اور مرغی پال منصوبوں کے تحت مربعے دیئے گئے۔

ضلع نواب شاہ کی چالیس ہزار ایکڑ اراضی جو چند فوجی اور سول وڈیروں کو الاٹ کی گئی۔ ایوبی مارشل لاء کے نفاذ سے تقریباً دس سال قبل خود کاشت کے اصولوں پر ۱۶ سے ۳۲ ایکڑ کے ٹکڑوں میں ہاریوں کو باقاعدہ الاٹ کی گئی تھی۔ یہ زمین جب ہاریوں کو دی گئی تو یہ خشک، بنجر اور بے آب و گیاہ تھی۔ اس پر کوئی فصل نہ ہوتی تھی، ہریالی کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن جب یہ خشک اور بنجر اراضی ہاریوں کو الاٹ کی گئی تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ ہاری اور کسان کو کیا چاہیے؟ چند ایکڑ اراضی جس پر وہ سونے جیسی فصلیں اگا کر اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھر سکے۔ انہوں نے شب و روز محنت کی خون پسینہ ایک کیا اور وہ زمین جہاں ہریالی کا نام و نشان نہ تھا سونا اگلنے لگی لیکن رات کے اندھیرے میں بزورِ طاقت برسرِ اقتدار آنے والے غاصب ایوب خان نے دن دہاڑے ان کی اراضی پر ڈاکہ ڈالا اور انہیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے بے دخل کر دیا گیا۔

ضلع ٹھٹھہ کی جو اراضی مسٹر عقیلی کو عطا کی گئی وہ بھی پہلے ہاریوں کے نام الاٹ تھی۔ جب یہ زمین مسٹر عقیلی کو الاٹ ہو گئی تو انہوں نے ہاریوں کی بے دخلی کا پروانہ جاری کیا۔ ہاریوں نے مزاحمت کی۔ بتایا جاتا ہے کہ قتل و غارت گری ہوئی۔ بعض ہاریوں کو پسِ زنداں کر دیا گیا۔ ریاستی طاقت مسٹر عقیلی کے ساتھ تھی۔ ظالموں نے ہاریوں کے گھر لوٹ لیے، فصل برباد کر دی۔ اسی طرح ضلع خیرپور موضع کرونڈی تحصیل فیض گنج پکہ کی اراضی ریاست پٹیالہ اور مشرقی پنجاب کے دیگر علاقوں کے بائیس مہاجر کسان خاندانوں کو بارہ ایکڑ فی خاندان کے حساب سے ۱۹۴۸ء میں الاٹ کی گئی تھی۔ یہ زمین بھی بالکل خشک اور بنجر تھی۔ مہاجر کسانوں نے بڑی محنت سے اسے قابلِ کاشت بنایا۔ اپنی زندگی کی تمام پونجی اس پر صرف کر دی لیکن فوجی کرنلوں اور جنرلوں کو خوش کرنے کے لیے انہیں بھی بے دخل کر دیا گیا۔ زمین سے محروم یہ ہاری در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ حکومت سے اپیلیں کیں۔ انصاف کے دروازے پر دستک دی مگر ان کا ہر احتجاج، ہر فریاد صدا بصحرا ثابت ہوئی، کوئی دروازہ نہ کھلا۔ آج بھی یہ ہاری بے یار و مددگار ہیں۔

تقاوی قرضے

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء سے قبل حکومتِ پاکستان نے زرعی پیداوار بڑھانے، مقامی اور غیر مقامی غریب ہاریوں اور کسانوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے تقاوی قرضے جاری کیے۔ یہ قرضے ایسے کاشتکاروں اور ہاریوں کو دیئے گئے جنہیں حکومت نے فی خاندان بارہ ایکڑ متروکہ اراضی الاٹ کی تھی۔ ہاریوں نے اس قرضے سے زرعی آلات خریدے، بیل خریدے اور اس طرح سے اچھی فصلیں پیدا کرنے کے اہل ہو گئے۔ لیکن پانچ سال کے بعد ان ہاریوں اور کاشتکاروں کو بے دخل کر دیا گیا۔ اور ان سے زمین چھین کر امیر مہاجر وڈیروں کو الاٹ کر دی گئی۔ جن ہاریوں کو بے دخل کیا گیا انہیں متبادل اراضی نہیں دی گئی۔ اور مزید ستم یہ کیا گیا کہ تقاوی قرضوں کے مطالبات زبردستی وصول کیے گئے حالانکہ ان پر روزگار اور کاشتکاری کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ ان کا کل اثاثہ اور پونجی لوٹ لی گئی تھی۔ ہاریوں کے پاس واجبات ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی اور وہ زمین بھی چھین لی گئی تھی جس کے لیے قرضے دیئے گئے۔ اس طرح سے ایوبی حکومت نے ہاریوں اور کسانوں کا حق مار کر اپنے اقتدار کو مضبوط کیا استحصالی چکی کی گردش تیز کر دی۔

اب بساطِ سیاست کے پٹے ہوئے مہرے جن کے برج عوام نے گزشتہ عام انتخابات میں الٹ دیئے تھے، ایوب خان کو دوبارہ برسرِ اقتدار لانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور گٹھ جوڑ کر رہے ہیں تاکہ مزید ہاری بے دخل ہوں۔ وڈیروں کی اراضی میں اضافہ ہو اور وڈیروں کی تعداد میں اضافہ ہو۔

تعلیمی وڈیروں کے مُہرے

پروفیسر غفور اور شاہ فرید الحق

ابوالحسین

ایک مشہور تعلیمی وڈیرے کے متعلین شدہ مقام پر نجی تعلیمی اداروں کے تمام پرنسپلوں اور مالکان کی خفیہ میٹنگ جاری ہے۔ ۳۲ پرنسپل ان میں سے ایسے ہیں جو اپنے اپنے کالجوں کے مالک تو نہیں ہیں لیکن ان کا سارا ماضی اساتذہ کا گلا کاٹنے اور تعلیمی وڈیروں کے ہاتھ مضبوط کرتے گزرا ہے۔ کالجوں کی اندھی کمائی میں سے انہوں نے بھی بہت کھایا ہے۔ ایسے پرنسپل بھی اس اجلاس میں بیٹھے ہیں جو اپنے اپنے کالجوں یا بالفاظ دیگر سونے کی کانوں کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ سب کے چہرے اترے ہوئے ہیں اور ہراساں ہیں۔ اس لئے کہ قرض حساب آن پہنچا ہے۔ یکم ستمبر سے حکومت تمام ملک میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لے رہی ہے۔ ایک پرنسپل نے کہا "لسانی تنازعے میں امید تھی کہ بھٹو صاحب کی حکومت کا بستر گول ہو جائے گا۔ اب ہم بھی شاید بچ سکیں۔ تعلیمی اداروں کو تو قومی ملکیت میں لے ہی لیا جائے گا۔" اس پر ایک اور پرنسپل نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے بدنام زمانہ کالج کے پرنسپل کو کہنی مار کر کہا۔ "یار تمہاری تو فائل بھی بہت موٹی ہو گئی ہے بدعنوانیوں کی۔" اس متفقہ میٹنگ میں پرنسپل حضرات کو لیاقت کالج کے پرنسپل اور سندھ اسمبلی کے رکن اور قائد حزب اختلاف جناب شاہ فرید الحق کے ٹیلی فون کا بھی انتظار ہے۔ کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اعلیٰ حکام سے قومیانے کی پالیسی کے بارے میں مزید کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت کی جانب سے تعلیمی ایڈوائزری کونسل کے رکن بھی ہیں۔ شاہ صاحب کے ایک دوست نے کہا: "یار اپنا مہرہ بیٹھا ہوا تو ہے۔"

اس میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جناح کالج کے مالک منشی ریاض الدین کو کنوینر بنا لیا جاتے۔ وہی ہماری طرف سے بیانات دیں۔ اساتذہ میں ہم منشی ریاض الدین کی برائی کریں گے اور درپردہ انہیں ہمارا تعاون حاصل رہے گا۔ منشی ریاض الدین دنیا دکھاوے کی عزت کے بھی قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حامی بھر لی اور فوراً ہی ایک بیان تیار کر کے اخبارات کو جاری کر دیا گیا۔ بعد میں اُن کی جانب سے ایک عدد مراسلہ ایک مقامی اخبار میں شائع ہونے کے لئے ڈرافٹ کیا گیا۔ چنانچہ گزشتہ دنوں منشی ریاض الدین کی جانب سے جو بعض احمقانہ بیانات کالجوں کو سرکاری تحویل میں لئے جانے کے خلاف آئے ہیں ان کے پیچھے پردہ زنگاری ہیں کچھ اور افراد کا ہاتھ ہے۔ اس مضحکہ خیز بیان میں ایک بار پھر اسلام کا سہارا لیا گیا اور فتویٰ مانگنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور شاید کوئی دن جاتا ہے کہ کسی نہ کسی نام نہاد عالم کی جانب سے اس خوشگوار تاریخی فریضے کے خلاف کوئی فتویٰ بھی شائع ہو جائے۔ میٹنگ کے دوران شاہ فرید الحق کا ٹیلیفون آیا انہوں نے بتایا کہ وہ بعض دوسرے سیاسی امور میں مصروف ہیں اور اس وقت میٹنگ میں نہیں آ سکتے۔ اس پر ایک پرنسپل نے کہا: "یار ضرور آجاؤ۔ چاہے پندرہ منٹ کے لئے۔ تمہاری کیا گفتگو ہوئی بتا جاؤ کیونکہ اکثر افراد سخت پریشان ہیں۔" چنانچہ تھوڑی دیر میں پان کا بٹوہ ہاتھ میں لٹکائے شاہ فرید الحق اس میٹنگ میں تشریف لائے۔ انہوں نے آتے ہی فرمایا: "میری ملاقات ہو چکی ہے۔ حکومت کا ارادہ اٹل ہے۔ وہ پرائیویٹ کالجوں کو ضرور سرکاری تحویل میں لے گی۔" پروفیسر عبدالغفور بھی دو دفعہ اس مسئلے پر حکومت سے مل چکے ہیں۔

"پھر اب کیا کیا جائے۔" "پہلے اخباری جہاد، بعد میں اپنا وہی ......" ایک مالک پرنسپل نے مکارانہ نظریں ساتھیوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

شاہ فرید الحق نے اپنے ساتھیوں کو وفاداری کا یقین دلایا اور چلے گئے۔ اب پھر تمام تعلیمی وڈیرے سر جوڑ کر بیٹھے۔ یہاں تک تو طے ہی پا چکا تھا کہ منشی ریاض الدین مالکان کا محاذ سنبھالیں گے اور اخباری بیانات کی توپیں داغیں گے۔ اب یہ مشورہ ہونے لگا کہ کس طرح سیاسی جماعت کے ارکان کو ساتھ ملا کر اساتذہ کی ایسوسی ایشن اور اُن کی سندھ صوبے کی صدر مس انیتا غلام علی کے خلاف کیچڑ اچھالا جائے نیز اساتذہ میں افواہیں پھیلائی جائیں۔

ایک پرنسپل نے کہا: "جماعت اسلامی سے بیان دلوایا جائے۔" مگر اُن کے منشور میں بھی نجی تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لینے کا دعویٰ موجود ہے۔ پھر انیپ کو پکڑو۔ اس جماعت کا منشور بھی یہی کہتا ہے۔

اس پر ایک ہوشیار پرنسپل نے کہا: "یار اپنے شاہ میاں نورانی کی جماعت پکڑو۔" "وہ تو اپنے ساتھ ہے ہی۔ شاہ فرید الحق۔" اس پر ایک پرنسپل نے کہا: "بس یہی جماعت ٹھیک رہے گی۔ مگر شاہ فرید الحق کو سامنے مت لاؤ۔ ایک تو وہ حزب اختلاف میں لسانی تنازعے کے سلسلے میں بہت بدنام ہو گئے ہیں۔ دوسرے لیاقت کالج ملیر کے بانیوں اور حصہ داروں میں سے ایک ہیں۔ مگر یہ مشکل تو شاہ صاحب ہی حل کر سکتے ہیں۔ یار آسان بات ہے ان کی زیر نگرانی ظہور الحسن بھوپالی کو پکڑ لیا جائے۔ ساتھ میں بوستان علی ہوتی۔ ظہور الحسن بھوپالی لڑکا ہے جو بیان دلواؤ گے دیگا۔ دوسرے اگر اس کے بیان میں کوئی اونچ نیچ کی بات ہو گی تو ہم لوگ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لڑکا ہے، ذرا ناسمجھ ہے اور یار وا بھی تو ہم میں سے بہت سے ایسے اس کے استاد موجود ہیں۔ جو زمانہ طالب علمی میں اُسے تقریریں لکھ کر دیتے تھے۔ چنانچہ طے پایا کہ سیاسی سطح پر بیان بازی کے لئے ظہور الحسن بھوپالی اور بوستان علی ہوتی مناسب رہیں گے۔ اس طرح فضا ساز گار بنا دو۔ تاکہ حکومت دوسرے معاملات میں اُلجھ جائے۔"

اساتذہ کو متاثر کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز طے ہوئیں۔

۱:۔ اساتذہ کو ڈرایا جائے کہ اُن کا تبادلہ بیرون کراچی ہو جائیگا۔

۲:۔ انہیں یہ بتلایا جائے کہ ان پر ناپسندیدہ شخصیات بحیثیت پرنسپل تعینات کر دی جائیں گی۔

۳:۔ اساتذہ کی ملازمتوں کا تحفظ خطرے میں پڑ جائیگا۔

۴:۔ وہ گورنمنٹ کالج کے استادوں کے مقابلے میں جو نیئر رہ جائینگے۔

۵:۔ ان کی سیاسی آزادی ختم ہو جائے گی۔" معلوم نہیں کس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ ایسی صورت میں اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ حکومت سے تعلیمی پالیسی کی تفصیلات طلب کریں اور حکومت کے خلاف ابھی سے بیانات دینا شروع کر دیں۔"

اس پر ایک پرنسپل صاحب نے جو بعض حلقوں میں کچھ عرصہ قبل سوشلسٹ بھی گردانے جاتے تھے۔ یہ کہا۔

"یار وہیں تو تمام اساتذہ سے یہ کہہ رہا ہوں، کہ

پہلے یہ تو دیکھو کہ بھٹو کی حکومت قومی ملکیت کا تصور کیا لیتی ہے؟ کہیں کارخانوں کا سا انداز تو نہیں کر رہی ہے۔ آپ لوگوں کا کیا بنے گا؟"

اس پر ایک صاحب نے سوال کیا۔ تو پھر اساتذہ کا ردِ عمل کیا ہوا۔ بس اساتذہ تو ایک ہی رٹ لگا رہے ہیں "قومی ملکیت میں ضرور جانا چاہیئے۔ پھر انہوں نے ایک لیکچرر کو گالی دے کر کہا" وہ تو کہنے لگا ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ قومی ملکیت میں لینے کے بعد ہمارا کیا بنے گا۔ ہم کہتے ہیں ان وڈیروں سے لو پھر چاہے گٹر میں ڈال دینا۔"

"اچھا تو نفرت اتنی بڑھ گئی ہے۔ یعنی اب پاؤں ٹکتے نہیں لگتے"۔ ایک پرنسپل صاحب نے جو اساتذہ سے درشتی سے پیش آنے میں مشہور ہیں کہا:

یہ تھی اس خفیہ میٹنگ کی روداد، جس کا عملی مظاہرہ پرنسپلوں اور مالکان کی اساتذہ سے ملاقاتوں کے دوران بھی ہو رہا ہے۔ دوسری طرف سیاسی فرنٹ پر بھی اس پلان پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے چنانچہ ۱۲ اگست کے اخباروں میں بوستان علی ہوتی اور ظہور الحسن بھوپالی

کے حق میں مضرت رساں ہیں۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ پہلے حقائق کا تجزیہ کریں اور پھر فیصلہ کریں۔"

اس بیان میں بعض باتیں افسوس ناک ہیں اور بعض مضحکہ خیز۔ صوبہ سندھ نے ابھی انتشار پسندوں کی اٹھائی ہوئی آگ سے نجات پائی ہے۔ کیا از سر نو ایک قطعی بے بنیاد بات کو بنیاد بنا کر علاقہ واریت کی ایک نئی آگ جلا دینے والے قوم و ملک کے دوست ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ ظہور الحسن بھوپالی کو یہ بیان اُن کے آقاؤں کی جانب سے ملا ہے۔ اس طرح وہ کراچی کے جیالے اور باشعور طالب علموں کو اس فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ انتہائی نامناسب اور غلط سلوک ہونے والا ہے۔ اور وہ عوامی حکومت اور اساتذہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں لیکن ایسے عوام دشمنوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ گو تعلیمی وڈیروں کے پاس اساتذہ کا استحصال کر کے کمائی ہوئی بے پناہ دولت ہے جس سے وہ طلبہ کے چند نام نہاد لیڈروں کو ممکن ہے خرید بھی سکتے ہوں لیکن اگر میدان حق

خفیہ میٹنگ کے ارکان شاہ فرید الحق کے ٹیلیفون کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے

کا ایک زہریلا بیان شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے مس انیتا غلام علی کو ایک خاص علاقے سے نسبت دیکر غیر سندھی طلباء کو تعلیم سے محروم کرنے کی سازش کا الزام لگایا ہے۔ قارئین کے لئے اخباری بیان پیش کیا جاتا ہے۔

"اراکین صوبائی اسمبلی جناب ظہور الحسن بھوپالی اور جناب بوستان علی ہوتی نے ایک مشترکہ بیان میں مس انیتا غلام علی کے رویے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اساتذہ کی نمائندہ ہونے کے باوجود اساتذہ کے مفاد کے خلاف باتیں کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لوگ جانتے ہیں کہ اساتذہ کے مخصوص گروہ کی ان نام نہاد لیڈر نے اساتذہ کے لئے کیا کیا ہے اور ہم نے کیا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ شاید مس انیتا غلام علی تعلیمی اداروں کو قومیانے کی حمایت کر کے غیر سندھی طلباء کو تعلیم سے محروم کر دینا چاہتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم سوشلسٹوں کی غلط پالیسیوں اور تعلیمی اداروں کو قومیانے کی بہر صورت مخالفت کرتے رہیں گے۔ انہوں نے حکومت کی اس بات کی بھی مذمت کی کہ ان کے خاتمہ کی آڑ میں نوکر شاہی کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جا رہے ہیں جو ایک عام آدمی

کے ہاتھ میں رہے گا۔ بیان اور اس میں یہ لائن بطور خاص جان بوجھ کر طلبہ کو مشتعل کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔

جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے ان میں یقیناً دائیں اور بائیں بازو کا رجحان رکھنے والے موجود ہوں گے۔ لیکن یہ مسئلہ نظریاتی نہیں معاشی ہے۔

اس میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات جو بوستان علی ہوتی اینڈ کمپنی سے سرزد ہوئی ہے وہ یہ کہ "دیکھا جاتی ہے کہ ان نام نہاد استاد لیڈر خاتون نے کیا کیا ہے اور ہم نے اساتذہ کے لئے کیا کیا ہے۔؟"

اس سلسلے میں اتنا عرض ہے کہ وہ صرف استحصال میں دلچسپی رکھنے والے اور اساتذہ کے معاشی قتل عام کرنے والوں کے ہی شریک ہیں اور ان کی خدمت کو وہ اساتذہ کی خدمت سمجھ رہے ہیں۔ ظہور الحسن بھوپالی صاحب کی عمر کیا ہے؟ اور کون سے تعلیمی ادارے میں انہوں نے کام کیا ہے؟ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ وہ پہلے نظریاتی انسان بننے کے باوجود ساحر و فیض کے اشعار اپنی رٹی ہوئی تقریروں میں پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں سفارشوں سے وہ ایک اخبار میں پہنچ گئے۔ صحافیوں کی ہڑتال میں بھی ان کا جو رویہ رہا۔ کیا اسے بھی صحافی برادری کے لئے خدمات کہا جا سکتا ہے؟ البتہ شکریہ ادا کریں سادہ لوح عوام کا جنہوں نے اُن کی کمر پر رحسم کھا کر اور ان کی اسلام پسندی کے دھوکے میں انہیں ووٹ دیکر کامیاب بنا دیا۔ آج تک انہوں نے یا تو اپنی ذاتی

خدمت کی ہے یا استحصالی قوتوں کی۔

جہاں تک شاہ فرید الحق صاحب کا معاملہ ہے تو وہ اپنے ہاتھ پر مختلف اوقات میں طوطے ہی بٹھاتے رہتے ہیں۔ آخر وہ جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ اور اسلامیہ کالج کراچی میں اے۔ ایم۔ قریشی کی ملازمت کر چکے ہیں۔ جس آدمی کو زمانے کی اونچ نیچ سے بہت زیادہ آگاہی حاصل کرنی ہو، یا زیادہ سے زیادہ انکریمنٹ لینے ہوں اسے اسلامیہ کالج میں قریشی صاحب کے زمانے میں پہنچنا چاہیئے تھا۔ جناب شاہ فرید الحق صاحب بھی ایسے ہی خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک بیشتر حصہ اے۔ ایم۔ قریشی کی خدمت گزاری میں بسر کر دیا۔ اُن کی قریشی صاحب سے وابستگی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اسلامیہ کالج میں اچھے اور نیک ٹیچر انہیں دور سے آتا دیکھ کر کہتے تھے "خاموش رہو قریشی کا چمچہ آرہا ہے"۔ ان کی یہ وفاداری اُن کے دوست دشمن سب کو ناپسند تھی۔ چنانچہ خود پروفیسر شجاع احمد زیبا، شاہ فرید الحق سے بازی نہ لے جا سکے۔ دونوں میں کشیدگی رہی۔ مگر اپنا کام نکال کر قریشی نے دونوں کو ہی نکال باہر کیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے اوصاف حمیدہ سے واقف تھے لہٰذا قریشی کی دشمنی میں دونوں یکجا ہو گئے اور ایک کالج علیحدہ میں کھولا۔ اس کالج میں پروفیسر شجاع احمد زیبا اور شاہ فرید الحق کے علاوہ تین حصہ دار اور ہیں اور اب یہ کالج ایک بڑی جاگیر بنتا جا رہا تھا۔ تو اس وقت بھٹو صاحب نے تعلیمی پالیسی کا اعلان کر دیا۔ صاحب یہ سراسر زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ چنانچہ ایک روایت عام ہے کہ سندھ میں ۶ جولائی کو لسانی تنازعہ شروع کرانے سے چند دن قبل جناب شاہ فرید الحق، ظہور الحسن بھوپالی کے ہمراہ ممتاز بھٹو سے ملے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اور اردو زبان کی مظلومیت کا تذکرہ کر کے آخر میں بولے۔

"بھٹو صاحب تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں نہ لیں"۔

ممتاز بھٹو نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"شاہ صاحب گھبراتے کیوں ہیں۔ میں آپ کا ادارہ exempt کرا دوں گا۔ باقی قومی ملکیت میں تو لئے ہی جائیں گے۔ کیونکہ یہ ہماری پارٹی کے منشور میں ہے۔ اس وقت سے ہی شاہ فرید الحق اور ظہور الحسن بھوپالی کے دل میں اردو زبان کا درد سوا ہو گیا تھا۔

ان تمام حالات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تعلیمی وڈیرے اپنے سیاسی مہروں کو استعمال کرتے ہوئے ایک بار پھر ہنگامہ کرانا چاہتے ہیں جس کی شروعات ہو چکی ہیں۔ لہٰذا حکومت کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اساتذہ اور طلبہ کی بے پناہ قوت حکومت کے ساتھ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ شاہ فرید الحق کو تعلیمی ایڈوائزری کونسل سے سبکدوش کر دے۔ کیونکہ ایک کالج کا مالک ہونے کے سبب ان کی غیر جانبداری پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

اظہارِ خیال

سید محمد تقی

خودساختہ مارکسزم کے دعویدار بن گئے

ڈاکٹر فیروز احمد مدیر پاکستان فورم کینیڈا

۲۷ جولائی کے "الفتح" کے شمارے میں سید محمد تقی کے وضاحت نامے سے بڑی کوفت ہوئی۔ یہاں مَیں زبان کے مسئلے پر تجزیہ تو نہیں کروں گا البتہ ان دو باتوں کا جواب ضرور دوں گا جس کا ذکر تقی صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔

(۱) تقی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ سندھ کی سرکاری زبان کی حیثیت سے اُردو اور سندھی کا مطالبہ مارکسزم کے عین مطابق ہے مجھے اس بارے میں علم نہیں تھا کہ موصوف ایک خود ساختہ مارکسزم کے دعویدار بن بیٹھے ہیں۔ اگر وہ مارکسزم کی روشنی میں زبان کے سوال کی صحیح پوزیشن جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو مَیں انہیں مشورہ دُوں گا کہ وہ اسٹالن کی کتاب "مارکسزم اینڈ نیشنل کوسچنز" لینن کے مضامین "رائٹ آف نیشن ٹو سیلف ڈیٹرمنیشن" اور "کریٹیکل ریمارک آف دی نیشنل کوسچنز" اور "دی سوشلسٹ ایولوشن اینڈ دی رائٹ آف نیشن ٹو سیلف ڈیٹرمینیشن"، کا بغور مطالعہ کریں اگر وہ یہ کتابیں اور پمفلٹ حاصل نہیں کر سکتے تو مَیں انہیں پاکستان فورم کے ستمبر کے شمارے کے مطالعہ کا مشورہ دُوں گا جس میں مذکورہ بالا کتابوں اور پمفلٹوں کا خلاصہ شائع کیا جائے گا۔

(۲) مسٹر تقی نے اعداد و شمار کے ذریعے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ (الف) شہر میں سندھی بولنے والوں کی تعداد ۶۵ فیصد ہے اور دیہی علاقوں میں سندھی بولنے والوں کی تعداد ۳۵ فیصد ہے۔ (ب) اُردو سندھ کی اکثریتی زبان ہے اور اگر اس سلسلے میں ریفرنڈم کرایا جائے تو اردو کی فتح ہوگی۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس طرح اردو اور سندھی دونوں کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ سندھی بولنے والوں کے حق میں جاتا ہے جو جمہوری طریقہ سے اپنی زبان کا تحفظ حاصل کرنے میں ناکام ہو سکتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ مسٹر تقی نے یہ اعداد و شمار کہاں سے حاصل کیے۔ مَیں ایک پیشہ ور ڈیموگرافر ہوں اور مَیں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ پاکستان کی آبادی کے رجحانات کے تجزیے میں گزارا ہے بالخصوص سندھ میں! جہاں تک میرا خیال ہے ۱۹۶۱ء کی مردم شماری پاکستان کی آبادی کے تازہ اعداد و شمار ہیں۔ اس مردم شماری کی روشنی میں سندھ (خیرپور ڈویژن، حیدرآباد ڈویژن اور کراچی) کی آبادی کی پوزیشن مندرجہ ذیل ہے:

آبادی	تعداد	فیصد
کل آبادی	۸۴,۶۸,۷۱۲	۱۰۰٫۰۰
شہری آبادی	۳۱,۷۱,۸۵۶	۳۷٫۴۵
دیہی آبادی	۵۲,۹۶,۸۵۶	۶۲٫۵۵

مادری زبان

کل	۸۴,۶۸,۷۱۲
سندھی	۴۷,۸۳,۲۹۳
اردو	۱۷,۵۷,۵۷۱
پنجابی	۵,۷۸,۶۶۴
بلوچی	۵,۳۶,۵۴۴
بروہی	۱,۶۶,۵۴۵
پشتو	۱,۴۹,۹۴۶
راجستھانی	۱,۱۷,۷۴۳
متفرق	۱,۳۹,۳۸۳

جو زبانیں بولی جاتی ہیں (مادری زبان یا کسی اور حیثیت سے)

سندھی	۵۳٫۴ لاکھ	۶۳ فیصد
اردو	۲۴٫۷ لاکھ	۲۹ "

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ اردو سندھ میں صرف ۲۰٫۷۵ فیصد آبادی کی مادری زبان ہے۔ یہ اعداد و شمار ان کے اس دعوے کا بھی منہ چڑاتے ہیں کہ سندھی بھی اردو بولتے ہیں سندھ کی ۶۳ فیصد آبادی سندھی میں بات چیت کرتی ہے جبکہ اردو بولنے والوں کی تعداد صرف ۲۹ فیصد ہے۔ مسٹر تقی نے غلط اعداد و شمار کے ذریعے عوام کو ورغلانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے سرائیکی کو سندھی سے علیحدہ کر کے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ سندھ کے دیہی علاقوں میں بے شمار افراد بلوچی بولتے ہیں جبکہ شہروں میں اردو کے علاوہ پنجابی پشتو، بلوچی اور گجراتی بولنے والوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس طرح موصوف نے اصل حقائق پر پردہ ڈالنے کی بے سود کوشش کی ہے۔ کیا وہ سندھی کے خلاف مہاجر، پنجابی، پٹھان، بلوچی گجراتی متحدہ محاذ بنانے والے ہیں؟ اگر وہ ایسا کرنے والے ہیں تو انہیں شدید مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سندھ میں آباد ہونے والے بلوچی، بروہی، راجستھانی اور پرانے پنجابی آبادکاروں کی مادری زبان سندھی نہیں ہے اس کے باوجود انہوں نے سندھی کو قبول کیا اور اسے کاروباری زبان کی حیثیت سے استعمال کیا۔ حالیہ فسادات اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اردو شاونسٹ جہاں پٹھانوں اور گجراتیوں کے جذبات بھڑکانے میں ناکام رہے وہاں انہیں اردو بولنے والے محنت کشوں کی سرد مہری کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ آخر مسٹر تقی اور ان جیسے شاونسٹوں کو اس بات کا یقین کیسے ہو گیا کہ زبان کے سوال پر اگر ریفرنڈم کرایا جائے تو ان کی کامیابی یقینی ہے؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پٹھان، پنجابی، بلوچی بروہی، گجراتی اور راجستھانی جو علیحدہ قومی تشخص رکھتی ہیں، وہ اردو کے شاونسٹوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے کے لیے تیار ہو جائیں گی؟ ایسے تمام افراد کو جو سندھی نہیں بولتے انہیں "اردو والوں" میں شامل کر کے جہاں وہ اپنی جہالت کا بھانڈا پھوڑتے ہیں وہیں سندھ کے محنت کشوں کے خلاف ان کا ناپاک منصوبہ بھی واشگاف ہوتا ہے۔

یہاں ہم تقی صاحب کی طرح غلط اعداد و شمار کے ذریعے زبان کے سوال پر کوئی جانبدار فیصلہ مسلط کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ بڑی دیانت داری سے مردم شماری کے سال ۱۹۶۱ سے ۱۹۷۲ء تک سندھ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کا سرسری ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے چند اہم باتیں یہ ہیں۔

(الف) پنجابی اور پشتو بولنے والے محنت کش جو سندھ

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں

برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی بانی رکن مسز روز اسمتھ سے حامد ہاشمی کی خصوصی ملاقات

(آخری قسط)

> "عورتوں کا معاشی اور سیاسی رتبہ بلند کرنے کیلئے متحد ہو جاؤ"
> (چیئرمین ماؤزے تنگ)

بے شمار گروپ مارکسی لیننی کا لیبل لگائے اپنی اپنی دکان سجائے بیٹھے ہیں

ایک مزدور رہنما نے یونین کے سرگرم کارکنوں کی فہرست حکومت کو پہنچا دی

لیموں کی چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے کہا کہ "آج کوئی ذاتی سوال نہیں پوچھوں گا۔ برطانوی پارٹی کے قیام سے اب تک کے مختصر احوال جاننا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ پچاس برس سے بھی طویل جدوجہد میں آپ لوگوں نے کیا کھویا کیا پایا ہے۔"

"حق بات یہ ہے کہ میں خود کو اس کا فیصلہ کرنے کی اہل نہیں پاتی۔" مسز اسمتھ کہنے لگیں "جس پارٹی کے ساتھ میں کام کرتی رہی ہوں اس سے میرا رشتہ منقطع ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں، اس لئے کہ وہ پارٹی تحریف پسندی کی آغوش میں جا بیٹھی تھی۔ اور اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ واضح صورت نہیں اختیار کر پایا۔ بائیں بازو میں عجیب انتشار پھیلا ہوا ہے۔ بے شمار گروپ مارکسی لیننی کا لیبل لگائے اپنی اپنی دکان سجائے بیٹھے ہیں۔ نئی نسل پُرجوش جذبوں کے ساتھ میدان میں اتری ہے۔ اس صورت احوال میں بوکھلاہٹ کا شکار ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ دور برطانیہ میں ایک سچی مارکسی لیننی پارٹی کے قیام کے لئے بڑا موزوں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لیڈر لوگ اپنی انا کے حصار سے باہر نکلیں اور ان بکھرے ہوئے عناصر کو مجتمع کر دیں۔"

"میں آپ سے کوئی فیصلہ نہیں مانگ رہا" میں نے کہا "صرف آپ کی رائے جاننے کا آرزومند ہوں۔ آپ براہ راست اس جدوجہد سے وابستہ رہی ہیں، اس لئے آپ کی رائے میرے لئے بڑی وقعت رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے ہم یہاں سے بات شروع کر سکتے ہیں کہ برطانیہ کی پارٹی کا قیام کب اور کن حالات میں عمل میں آیا۔؟"

مسز اسمتھ کہنے لگی کہ "پارٹی کے قیام کے لئے بنیادی حالات سرمایہ دارانہ صنعت کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی انتشار اور بے چینی نے پیدا کئے تھے۔ پہلی عالمی جنگ، کہ اس قدر ہولناک تباہی کے سامان لے کر آئی تھی عالمی سرمایہ داری کے بحران کی پیداوار تھی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی تباہ کاریوں کے ہر سُو پھیلے ہوئے مناظر عوام کو اس فرسودہ معاشرتی ڈھانچے کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔ جس کی کوکھ سے ایسی انسانیت دشمن جنگیں جنم لیتی ہیں۔ اُدھر انقلاب روس کی فتح نے نشانِ منزل کا کام دیا۔ اعتماد کی روشنی نے پرولتاریہ کے سینوں کو منور کر دیا۔ انہیں اپنی فتح پر یقین حاصل ہوا اور نجات کی منزل بہت قریب نظر آنے لگی۔"

"پارٹی کے قیام سے قبل برطانیہ میں سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن کے نام سے بائیں بازو کی مزدور تحریک سال ہا سال سے سرگرم عمل تھی۔ یہ لوگ بنیادی طور پر مخلص تھے اور انقلاب کی آرزو رکھتے تھے۔ لیکن انقلاب کے طویل اور جانکاہ عمل کے واضح شعور سے بہرہ ور نہیں تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا محور بنیادی طور پر ٹریڈ یونین تحریک تھی۔ اس تنظیم میں مزدوروں کی اکثریت تھی۔ اگرچہ دانش ور اور نیم دانشور قسم کے روشن خیال لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کچھ لوگ مارکسزم کا بھی مطالعہ کرتے تھے اور اس کے حوالے سے بات بھی کرتے تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ تحریک اصلاح پسندانہ رجحانات کی حامل تھی۔ اسی زمانے میں امریکہ میں "دی انٹرنیشنل ورکرز آف دی ورلڈ" کے نام سے ایک تحریک کام کر رہی تھی۔ اس میں اکثریت غیر ہنرمند مزدوروں کی تھی۔ یہ لوگ بڑے ریڈیکل خیالات رکھتے تھے۔ مجموعی طور پر اس تحریک کا کردار سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن کے مقابلے میں کہیں زیادہ باغیانہ اور انقلابی تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ محض مزدوروں کے کارخانوں پر قبضہ کر لینے سے پرولتاریہ کے اقتدار کا باب کھل جائے گا۔ اس کے اثرات برطانیہ پہنچے۔ مزدوروں کا جذبۂ رفعتوں کو چھونے لگا۔ انقلاب اکتوبر کی فتح کے بعد پرولتاریہ کی حاکمیت محض ایک خواب یا آرزو نہیں رہی تھی۔ بلکہ ایک ٹھوس حقیقت میں ڈھل چکی تھی۔ دنیا بھر میں مزدور تحریک میں نیا ابھار پیدا ہوا۔ انقلاب اکتوبر کے بعد کے چند برس دنیا کے مختلف ممالک میں انقلابی پارٹیوں کے قیام کے لئے تیاری کا زمانہ تھا۔ خود ہماری پارٹی ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی۔ اسی سال چین اور دنیا کے متعدد دوسرے ممالک میں پارٹیاں قائم ہوئیں۔"

"مسز اسمتھ، کیا آپ اپنی پارٹی کے ابتدائی دور کے کردار اور عام راہ عمل پر کچھ روشنی ڈالیں گی؟" میں نے فوراً ایک سوال داغ دیا۔

"اس سلسلے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ ابتدائی دور میں پارٹی میں شمولیت کرنے والے بنیادی طور پر مخلص لوگ تھے" مسز اسمتھ نے جواباً کہا۔ "ان میں اکثریت صنعتی مزدوروں کی تھی۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ہم لوگ ذرائع ابلاغ اور کارخانوں پر قبضہ کر کے پرولتاریہ کا اقتدار قائم کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ انقلاب دروازے پر دستک دے رہا ہے اور کوئی دنوں میں زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے تصورِ انقلاب میں رومانیت شامل تھی۔ ہمیں احساس ہی نہیں تھا کہ یہ راہ کتنی طویل اور یہ سفر کس قدر پُرمحن ہے۔ ہم بڑے ذوق و شوق سے مارکسزم کا مطالعہ کیا کرتے تھے، لیکن پارٹی سطح پر بھی اس کا تخلیقی طور پر اطلاق کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ہماری صفوں میں مہم جوئی کا رجحان غالب تھا۔ ہم لوگ ٹریفک معطل کر دیتے۔ ٹیلی فون کے کھمبے گرا دیتے، مزدور جدوجہد کی بدولت کچھ نہ کچھ اقتصادی مراعات بھی حاصل کر لیتے۔ لیکن ہماری پارٹی مجموعی طور پر انقلاب کی طویل المدت حکمت عملی کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے میں ناکام رہی۔ ۱۹۲۶ء کی جنرل اسٹرائک کی ناکامی کا تجربہ ہماری آئندہ جدوجہد کی نہج کے تعین میں بڑا مفید ثابت ہو سکتا تھا، لیکن پارٹی قیادت اُس کی تلخیص کر کے صحیح نتائج اخذ نہ کر سکی، جس کے نتیجے میں حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔"

"جنرل اسٹرائک کو آپ کی پارٹی کی تاریخ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے" میں نے کہا۔ "اس لئے میری درخواست ہے کہ اس پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔؟"

"ایک عرصے سے جنرل اسٹرائک کے لئے تیاری ہو رہی تھی" مسز اسمتھ بتا رہی تھیں "ہم لوگ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ بیک وقت پورے ملک کی صنعت کو معطل کرنے کے بعد کارخانوں اور ملوں پر قبضہ کر لیا جائے گا اور یوں پرولتاریہ کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ ہڑتال کا بنیادی محرک یہی تصور تھا۔ منصوبے کے مطابق یہ ہڑتال ۱۹۲۵ء میں ہونا تھی، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ملتوی کرنا پڑی۔ ٹرانسپورٹ، کان کنی، ٹیکسٹائل اور انجینئرنگ کی صنعتیں سب سے بڑی اور اہم تھیں۔ یہ طے پا چکا تھا کہ سب صنعتوں میں بیک وقت ہڑتال ہوگی۔ عین وقت پر ٹرانسپورٹ کی صنعت کے مزدور راہنماؤں نے سودے بازی کر لی اور ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ہڑتال کے التوا کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سب سے زیادہ بے چینی کان کنی کی صنعت کے مزدوروں میں پائی جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ کانوں کے مالک اُن کی اجرت کی شرح میں مزید تخفیف کرنا چاہتے تھے۔ مزدور کسی بھی صورت میں اس نئے ظلم کو برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے، حالات دھماکے کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ حکومت نے خطرے کو بھانپتے ہوئے مالکوں کو امدادی رقوم دیں تاکہ وہ اجرت کی شرح میں کمی نہ کریں۔ اگرچہ یہ انتظام صرف ایک سال کے لئے تھا۔ لیکن اس سے وقتی طور پر مسئلہ حل ہو گیا۔ چنانچہ ہڑتال ملتوی کرنا پڑی۔ اس عرصے میں آجروں نے حکومت کی ملی بھگت سے جوابی حملے کی تیاری کر لی۔ جنرل اسٹرائک کے دوران آجروں اور بہت سے

برطانیہ کی سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن ایک اصلاح پسند تحریک تھی

کاروبار میں فریق کی حیثیت سے شریک تھی۔ اس کے باوجود پورے نو دن تک ہر جگہ ہڑتال رہی۔ حوصلے بہت بلند تھے۔ حکومت کی پوری مشینری بالکل معطل ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ پولیس کے ساتھ مسلح جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ہڑتال کا پورا مزاج ہی کچھ سے کچھ ہوتا جا رہا تھا۔ ہم لوگ سوویت نظام قائم کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن اُدھر بڑے بڑے ٹریڈ یونین راہنما بندۂ مزدور کی جدوجہد کے دام چکا چکے تھے۔ نو روز کے بعد لندن کے مرکزی آفس سے ہدایات موصول ہوئیں کہ مزدور کام پر واپس چلے جائیں۔ نیلے روشن آسمان سے ایسی خوفناک بجلی گرے گی، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ چٹانوں جیسے مضبوط کارکن دھاڑیں مار کر رو دیئے۔ ہر طرف عجیب افراتفری پھیل پھیل گئی۔ ہمتیں پست ہو گئیں۔ کچھ مزدوروں نے کام پر جانے کا فیصلہ کر لیا تو باقی بھی ان کی تقلید پر مجبور ہو گئے۔ البتہ کان کنوں نے ہڑتال جاری رکھی۔ لیکن یہاں بھی مسیح کے اپنے حواری بدنہاد دشمنوں سے اس کی زندگی کے دام وصول کر چکے تھے۔ ایک مزدور راہنما نے جو مزدوروں کے حلقے سے اور مزدوروں کے ووٹوں سے پارلیمان کا رکن منتخب ہو چکا تھا۔ کان کنوں کی یونین کے تمام سرگرم ارکان کی فہرست حکومت کو پہنچا دی۔ اگرچہ حکومت اور آجروں کو کان کنوں کی اجرت گھٹانے کی تو جرات نہ ہوئی لیکن یونین کے بیشتر سرگرم ارکان کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ جو جیل سے بچ گئے انہیں بیروزگاری کے جہنم میں دھکیل دیا گیا۔ یوں یہ عظیم الشان ہڑتال ناکام ہو گئی۔ مزدوروں میں حد سے زیادہ مایوسی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود پارٹی چیخ کر رہ گئی۔"

"جنرل اسٹرائک کی ناکامی سے پارٹی تنظیم اور پارٹی کی پالیسیوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟" میں نے کہا۔

"مزدور راہنماؤں کے درمیان خفیہ سودے بازیوں کا انکشاف ہوا لیکن بڑی گراں قیمت پر۔"

"مسز اسمتھ، ان خفیہ سودے بازیوں کی نوعیت کیا تھی۔؟" میرا اگلا سوال تھا۔

"جنرل اسٹرائک کی ناکامی کے ضمن میں یہ ایک اہم سوال ہے اور میں اس سلسلے میں خود کچھ کہنے والی تھی۔ یکم مئی ۱۹۲۶ء کو کان کنوں نے ملک گیر ہڑتال کر دی۔ پورے ملک کے مزدوروں نے مثالی اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کان کنوں کی حمایت میں کام بند کر دیا۔ مورال اس قدر بلند تھا کہ کوئی مزدور راہنما کھلے بندوں اس کی مخالفت کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بہت سی صنعتوں کے مزدور راہنما پہلے ہی اندر ہی اندر آجروں کے ساتھ سازباز کر چکے تھے۔ حکومت بھی اس گندے

الفتح کراچی

مسز اسمتھ نے کہا کہ "میں سمجھتی ہوں کہ ہڑتال کی ناکامی کے بعد ہماری پارٹی کا کردار بھی بڑی حد تک بدل گیا تھا مجھے اعتراف ہے کہ یہ کوئی خوش آئند تبدیلی نہیں تھی۔ ہڑتال کی ناکامی کی بہت سی وجوہات تھیں۔ مزدور راہنماؤں کی ایمان فروشی اور پارٹی کی عام راہِ عمل کی بنیادی غلطی کی نشان دہی کر چکی ہوں۔ ہم نے اپنے کام کو بہت آسان اور بڑا ہی مختصر سمجھ لیا تھا اور اپنی داخلی خواہشات کو معروضی حقائق سمجھتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ ہڑتال سے تھوڑا عرصہ پہلے پارٹی کے اول درجے کے تمام راہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے قیادت کا سنگین بحران پیدا ہو گیا۔ دوسرے درجے کے راہنماؤں نے تحریک کے مفادات کو فروخت کر دیا۔ متبادل قیادت تیار نہ کرنا دراصل پارٹی کی بہت بڑی ناکامی تھی۔ یہ بھی ہے کہ ہر قدم ہمیشہ فتح کی منزل تک نہیں لے جاتا۔ غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور ناکامیوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چاہیئے تھا کہ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا تجزیہ کیا جاتا اور ماضی کے ناکام تجربوں سے سبق حاصل کر کے حال کی راہوں کو روشن کیا جاتا اور پھر قدم قدم مستقبل کی فتوحات کی طرف بڑھا جاتا۔ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہم نے اپنی غلطیوں سے کچھ نہ سیکھا۔ جدوجہد کی بجائے سہل انگاری کی راہ اپنالی۔

تیسرے عشرے کے دوران ہم لوگ اپنی چھوٹی بڑی بے شمار غلطیوں کے باوجود بے حد مخلص تھے۔ انقلاب کی خاطر ہر پُل صراط سے گزرنے کو تیار تھے۔ کسی بھی قربانی کو بہت بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ پارٹی تنظیم بہت مضبوط تھی۔ کوئی شخص کڑے عمل سے گزر کر ہی پارٹی کا رکن بن سکتا تھا۔ اس کے برعکس چوتھے عرصے میں پارٹی کا پورا مزاج ہی بدل چکا تھا۔ اس میں موقع پرستی کا زہر بری طرح سرایت کر چکا تھا۔ متشدد جدوجہد کی بجائے پارلیمانی اور قانونی طریقے اختیار کرنے کی وکالت ہونے لگی۔ پارٹی نے بڑے پیمانے پر اپنے ارکان کو بورژوا پارلیمانی انتخابات لڑانے کا دھندا شروع کر دیا۔ پارٹی کو صحیح المسلک انقلابی جماعت بنانے کی بجائے کثیر العوام جماعت (Mass Party) بنانے کا فیصلہ ہوا۔ ہر کس و ناکس پر پارٹی کے دروازے کھول دیے گئے۔ چوتھے عشرے کے عالمگیر سرمایہ دارانہ بحران کے دوران دانشوروں کی بہت بڑی تعداد پارٹی میں شامل ہو گئی۔ اسی طرح درمیانے طبقے کے بوکھلائے ہوئے پریشان حال عناصر کو بھی یہیں جائے پناہ ملی۔ ان لوگوں کو انقلابی عمل سے گزرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لئے سچے انقلابی جذبے اور پرولتاری بصیرت سے عاری تھے۔ ان کی اکثریت کے نزدیک انقلاب بھی ایک رومان تھا۔ سو یہ اکثریت کڑے وقتوں کی مار نہ سہہ سکی اور موقع ملتے ہی عافیت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔"

"مسز اسمتھ، آپ نے بتایا ہے کہ برطانیہ کی پرانی کمیونسٹ پارٹی تحریف پسندی کی نذر ہو چکی ہے۔ یہ رجحان کب اور کیسے شروع ہوا؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے کہا: "آج جب تجزیہ کرنے بیٹھتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ تحریف پسندی کے جراثیم روزِ اول ہی سے موجود تھے۔ میں نے جو حالات بیان کئے ہیں اُن پر غور کیا جائے تو میری اس بات کی تائید مل جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تیسرے عشرے کے دوران تجربے، انقلابی عمل اور جدوجہد کی کمی کی وجہ سے غیر ارادی طور پر کچھ ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی تھیں جن میں تحریف پسندی کی جھلک ملتی تھی۔ لیکن چوتھے عشرے میں تو یہ رجحان اس حد تک بڑھا کہ بہت سے مخلص لوگ بجا طور پر اس سے شاکی ہو گئے۔ تحریف پسندی کا یہ زہر آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے چڑھا، ایسے ہی جیسے سردی مساموں کی راہ سے دماغ یا پھیپھڑوں کو متاثر کر دیتی ہے، لیکن اس کا احساس اُسی وقت ہوتا ہے۔ جب سرسام یا نمونیہ مریض کو ڈھا لیتا ہے۔

چوتھے عشرے میں پارٹی کو کافی معزز سمجھا جانے لگا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رجعت پسند بورژوا حکمران طبقوں کے نزدیک کوئی انقلابی کہلوانے والی جماعت اُسی وقت معزز بنتی ہے جب وہ صحیح انقلابی کردار سے تہی دامن ہو جائے جب اس کا کردار مخصوص مفادات کے سلسلے میں بے ضرر ہو کر رہ جائے۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔ افسوس کہ وقت اور واقعات کی نبض کو پہچاننے کی کوشش نہ کی گئی۔"

"اس زمانے میں انقلاب برپا کرنے کے لئے قوت کے استعمال کا ذکر ترک کر دیا گیا تھا۔ صرف پارلیمانی طریقوں سے انقلاب لانے کی باتیں ہوتی تھیں۔ پارٹی کو کثیر العوام جماعت بنانے کے زعم میں اصولوں کو تج دیا گیا تھا۔ سیاسی محاذ پر ساری کوششیں ٹوری پارٹی کی بجائے لیبر پارٹی کو برسر اقتدار لانے کے لئے صرف ہونے لگیں۔ صنعتی محاذ پر پارٹی معیشت پرستی (economism) کی شکار ہوئی۔ جو تحریف پسندی ہی کی ایک صورت ہے۔ انقلاب بس نعرے کے طور پر باقی رہ گیا تھا، ورنہ بورژوا سیاست کے سارے قرینے اختیار کر لئے گئے تھے۔"

"صنعتی اداروں میں شاپ اسٹیوارڈز کا نظام رائج کیا گیا تھا۔ ان کی اکثریت کا تعلق پارٹی سے تھا۔ صنعتی جھگڑے آئے دن کا معمول تھا۔ یہ لوگ ان تنازعوں میں کچھ اس حد تک اُلجھے رہتے تھے کہ سیاست کی بالادستی، مزدوروں کی سیاسی اور نظریاتی تربیت اور دوسرے انقلابی مقاصد پس منظر میں چلے گئے۔ یہ حضرات اپنے دائرۂ کار میں خاصے صاحبِ رسوخ اور با اختیار ہوتے تھے۔ ہوتے ہوتے ان کی اکثریت اپنی قائدانہ صلاحیت اور اختیارات کو اپنے ذاتی اوصاف سمجھنے لگی اور خود رُعمی کا شکار ہو گئی۔ یہ لوگ جتنے بڑے ٹریڈ یونین لیڈر بن جاتے، پارٹی کے نظم و ضبط سے اتنے ہی بے نیاز ہو جاتے۔ بہت سارے لوگ اس حادثے کی زد میں آئے عملی طور پر پارٹی کے قائدانہ منصب کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ دوسری مصروفیات کے نام پر پارٹی کے اجلاسوں تک میں شرکت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یہ اثرات بہت دور تک پہنچے۔ عام مزدور بھی پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بننے کے بعد اپنی موجودہ حیثیت کو مالی اور سماجی ہر دو اعتبار سے سابقہ حیثیت کے مقابلے میں بہتر پاتے تھے۔ یوں مزدوروں کیلئے پارٹی کا ہمہ وقتی کارکن بننا نفع بخش سودا بن گیا۔ ایسے حالات میں جب کہ سچا انقلابی فکر و عمل پہلے ہی مفقود ہو چکا تھا۔ نفع کا یہ کاروبار بہت سوں کو خراب کر گیا۔

"پارٹی کا اخبار "دی ڈیلی ورکر" بھی اس ابتلاء کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ہوتے ہوتے اس کے اصل مقاصد نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ پارٹی کا یہ ترجمان مزدوروں کی سیاسی تعلیم کے ساتھ پارٹی پروپیگنڈہ کا وسیلہ بنتا۔ ابتدا میں اس نصب العین کو بتمام و کمال پیش نظر رکھا بھی گیا، لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کا سارا مزاج ہی بدل دیا گیا۔ اخبار کی اشاعت بڑھانے کے مقصد کو اولیت دی جانے لگی۔ اس کے لئے سنسنی خیزی کو شعار بنایا۔ ظاہر ہے کہ پارٹی کے ترجمان کو قبولِ عام کی منزل تک پہنچانے کا یہ بڑا ہی سستا اور لچر طریقہ تھا۔ اسے عوام میں مقبول بنانے کے لئے بہتر انداز بھی اختیار کیا جا سکتا تھا۔ بورژوا سماج کے اندرونی تضادات سے جنم لینے والی طبقاتی کشمکش کے گوناگوں پہلوؤں کو نمایاں کر کے یہی مقصد حاصل ہو سکتا تھا۔ ابتدا میں رپورٹنگ سے لے کر ڈیسک ورک تک سارا کام مزدور خود کرتے تھے۔ اب پیشہ ور اخبار نویسوں کو بھرتی کیا جانے لگا۔ میں نے اس اخبار کو اپنی زندگی کے پورے اکیس ۲۱ برس دیئے ہیں شغف کا یہ عالم ہوتا تھا کہ میں نے مسلسل دس ۱۰ برس تک ایک دن بھی چھٹی نہیں کی تھی۔ لیکن جب اخبار کی پالیسی میں اس قسم کی منفی تبدیلیاں آئیں تو میں احتجاجاً مستعفی ہو گئی۔"

"دوسری عالمی جنگ کے سلسلے میں بھی پارٹی کا کردار کچھ ایسا قابلِ ستائش نہیں رہا۔ فسطائی قوتوں کے خلاف لڑنا بے شک مستحسن فعل تھا لیکن پارٹی نے اس ضمن میں بھی اس قدر غلو کیا کہ "تمام مساعی جنگی مساعی کی خاطر" کا بے ہودہ نعرہ دیا، اندرونِ ملک طبقاتی جدوجہد کا نام تک لینا چھوڑ دیا۔ حالانکہ ہماری لڑائی دونوں محاذوں پر جاری رہنی چاہیئے تھی۔ یہ دائیں بازو کی موقع پرستی تھی اور اس کا مقصد محض حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخلص لوگوں کا پارٹی پر سے اعتماد اٹھ گیا اور جنگ کے بعد ان کی بہت بڑی تعداد پارٹی کو چھوڑ گئی۔ اور جو باقی رہ گئے وہ یا تو اس موقع پرستی کے کھیل میں شعوری طور پر شریک تھے یا طوعاً و کرہاً یہ سب کچھ برداشت کئے ہوئے تھے۔"

"مسز اسمتھ، آپ جس خلوص کے ساتھ اپنی پارٹی کے ماضی کو سمجھنے میں میری مدد کی ہے اس کے لئے محض شکریہ ادا کر دینے سے ہرگز میرے احساسِ ممنونیت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔" میں نے کہا۔

"اس تکلف کی بھی ضرورت نہیں،" مسز اسمتھ نے مسکرا کر کہا "اس غیر رسمی بات چیت سے ہم دونوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہوا ہے۔"

"آپ کے ہاں تحریک کے موجودہ کردار کے بارے میں بھی کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے پھر کسی شام کو آپ کو زحمت دوں گا۔ شب بخیر، شب بخیر۔"

افسانہ

بھوک اور انسان

مرزا قیصر جاوید

پچھلے چار گھنٹوں سے پنکھا لگاتار میرے سر پر "گھوں گھوں" کئے جا رہا ہے ——— وہ گھومنے کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں لڑکھڑاتا بھی ہے ——— اس عرصے میں جتنی بار بھی میری نظریں اس کی طرف اٹھیں، ہر بار یہی محسوس ہوا کہ اگلے ہی لمحے وہ میرے سر پر آگرے گا۔ مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا ——— پنکھے کی گھوں گھوں سے گھبرا کر میں ٹوٹے کواڑوں والی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہوں

——— "اللہ کے نام پر دے بابا ——— !"

بوڑھا فقیر نہ جانے کتنے چکر اس تپتی سڑک کے لگا چکا ہے۔ اس کی آواز دھوپ میں پگھلتی ہوئی میرے کانوں تک بہہ آتی ہے مگر گھوں گھوں کرتا پنکھا اسے پھر ٹوٹی کھڑکی سے باہر الٹ دیتا ہے۔ فقیر کی لاٹھی کی "ٹک ٹک" بھاگتی کاروں کے شور میں کچلی جا رہی ہے ——— پیدل چلنے والے اسے روندتے ہوئے گزر رہے ہیں مگر وہ ہر ناکام صدا کے بعد ایک اور صدا لگاتا ہے ——— اور پھر ایک اور ———

پنکھے کی ہوا سے پھڑپھڑاتا اخبار میز پر ادھر سے اُدھر اُڑ رہا ہے ——— چائے کے تیسرے کپ کا گھونٹ لیتے ہوئے شاید میں سویں مرتبہ اس پر نظریں جماتا ہوں ——— "ملک میں چار کروڑ نئے مکان تعمیر کئے جائیں گے ——— کراچی اور لاہور کو نئے طرز پر آباد کیا جائے گا ———"

میں نظریں اٹھاتا ہوں ——— ٹوٹی کھڑکی سے باہر کچے مکانوں کی لاتعداد ڈھیریاں بکھری ہیں ——— ان ڈھیریوں میں رہنے والے مُردے چلتے پھرتے بھی ہیں ——— ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو ایک مُردہ میرے سامنے بیرے سے پانی مانگ رہا تھا۔ گرمی کے باعث اس کی بہن کو چکر آیا تو وہ قبر سے باہر پانی ڈھونڈنے چلا آیا ——— مگر پانی اتنا سستا کہاں اور پھر وہ بھی برف والا ——— وہ ناکام لوٹ گیا۔ بیرے نے میری میز پر برف والا پانی رکھتے ہوئے کہا۔

"بابو جی۔ منگتے ہیں یہ لوگ تو ——— پانی انہیں ملتا نہیں ——— روٹی اُن کے پاس نہیں ——— جسم ڈھانپا جاتا نہیں ——— پھر یہ مر کیوں نہیں جاتے ———؟؟؟"

"میں تمہیں ایک لطیفہ سناؤں ———" میں نے بیخیالی میں بیرے سے کہا۔

"جی ———" بیرے نے دانت نکال دیئے ———

"——— ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک قبرستان میں دو ڈھانچے محو گفتگو تھے ——— ایک نے کہا ——— "میں تو مرا تھا چیچک سے ——— تم کیسے مرے تھے ———" دوسرے نے دانت نکالتے ہوئے کہا ——— "میں تو زندہ ہوں ———"

"کیا سمجھے ———" میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ناسمجھ بیرے کو دیکھتے ہوئے کہا ——— وہ جا چکا ہے اور اب میں K-2 کے ڈبل پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے اس مُردہ کو دیکھ رہا ہوں، جس میں مٹی کی ڈھیریوں میں رہنے والوں کی زندگی بند ہے ——— بیرا جب میرے لئے گلاس بھر کر لایا تو ڈاٹ کھلا رہ گیا تھا ——— اور ——— زندگی بہتی ہوئی نالی میں گرتی رہی ———

بھئی آخر نوکری کب ملے گی ——— ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے پھر تمہیں نوکری کیوں نہیں ملتی ——— چچا کے الفاظ برچھیوں کی مانند میرے کانوں میں سوراخ کرنے لگے۔ "تم آخر جوان ہو تگ و دو کرنے پر ہی نوکری ملے گی ———" وہ رُک کر میرا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔ پھر رُخ پھیرتے ہوئے بولے ——— "آج کوشش کرو ——— ورنہ ———"

اور میں بھاگ کر دو منزلہ عمارت سے باہر نکل آیا ——— دیوانہ وار "خدا" کو تلاش کرتے کرتے جسم تھک رہا تھا ——— مگر خدا نہ جانے کہاں کھو گیا ہے ——— وہ اِن اندھیروں میں دکھائی نہیں دیتا ———

"بابو جی چائے اور لاؤں ———؟"

بیرا مجھ سے پوچھ رہا ہے کیونکہ میرے بیٹھنے کا وقفہ بڑھتا جا رہا ہے ——— نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے میں سوچتا ہوں ——— ایک گھنٹے کا سٹنگ ٹیکس چائے کا ایک کپ ———

ٹوٹی کھڑکی سے باہر دھوپ ڈھل رہی ہے ——— فقیر کی صداؤں میں بھی تازگی کا رس بھر آیا ہے ——— شاید پیتل کے کٹورے میں ٹیڈی پیسوں کے سورج غروب ہونا شروع ہو گئے ہیں ——— مٹی کی ڈھیریوں کے عقب میں سینما کی روشنیاں جگمگا اٹھی ہیں ——— مگر روشنی ابھی دھندلی ہے ——— سورج ابھی پوری طرح ڈوبا نہیں ——— میں ڈیڑھ روپیہ، چھ گھنٹوں کی قیمت ہوٹل والے کی میلی ہتھیلی پر رکھ کر باہر نکل آیا ہوں ——— سڑک پر فقیر کی صدائیں اب بھی گونج رہی ہیں ——— مجھ سے آگے ایک نوجوان جوڑا مارنج پاسٹ کر رہا ہے ——— اُن کی دبی دبی سرگوشیاں میرے پاس بھاگی چلی آ رہی ہیں یا شاید میں انہیں اپنے ساتھ بھگانا چاہتا ہوں ———

"ڈارلنگ جانتے ہو اس سالگرہ پر میں ڈیڈی سے کون سا تحفہ لے رہی ہوں ———"

"ہاں۔ جانتا ہوں ———"

"کیا ———"

"——— تم اُن سے میرے ساتھ شادی کرنے کی اجازت لو گی ——— پھر ہم ہنی مون کی راتیں پیرس کے نائٹ کلبوں، لندن کی جگمگاتی روشنیوں اور سوئٹزرلینڈ کی سرسبز وادیوں میں گزاریں گے ———"

"نہیں ———" لڑکی شرماتی ہوئی بولی ———

"——— تو پھر تم نے ڈیڈی سے نئی بیوک کا پرزنٹ لینا ہو گا ——— تاکہ ہم دونوں میرج کے بعد اس پرانی ٹیوٹا کے مسلسل عذاب

سے بچے رہیں جو بغیر دھکے کی چلتنے ہی نہیں ــــ"

"نہیں ڈارلنگ یہ بھی نہیں ــــ چلو میں خود ہی بتائے دیتی ہوں ــــ" لڑکی نوجوان کے شانوں سے مس ہوتی ہوئی بولی۔

"ڈیڈی سے میں نے اُن کی مصروفیت کے دو گھنٹے مانگے ہیں۔ جن میں وہ مجھ سے باتیں کیا کریں گے۔ ڈارلنگ اب میں اُن کے پیار کو ترسوں گی نہیں ــــ وہ جو اپنا سارا وقت باہر گزارتے ہیں آخر اس پر میرا بھی تو کچھ حق ہے نا ــــ"

"تم پاگل ہو روبی ــــ یہ بھی کوئی تحفہ مانگا ہے تم نے ــــ" لڑکا جھنجھلاتا ہوا بولا ــــ "کیا ہوا اگر وہ دن بھر مصروف رہتے ہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ ہوں ــــ"

لڑکی دھیرے سے ہنسی ــــ پھر سر جھکائے آہستگی سے بولی ــــ

"کیا تم میرے ڈیڈی ہو ــــ؟"

سگریٹ میری انگلیوں میں کانپ کر رہ گیا ہے ــــ میں جلدی جلدی قدم آگے بڑھاتا ہوں ــــ لڑکا آنکھوں میں غصہ لئے سامنے گھور رہا ہے اور لڑکی معصوم نظروں سے اس کی بدلتی رنگت کو دیکھ رہی ہے ــــ میں آگے بڑھ رہا ہوں ــــ نوجوان جوڑا کافی پیچھے رہ گیا ہے ــــ یکایک میرے قدم سُست پڑ جاتے ہیں ــــ ساہیوال ہال کے پلاٹ میں زرد، سُرخ ــــ اور گلابی پھولوں پر ایک سیاہ آنچل جُھکا ہے ــــ میں آنچل کی اوٹ سے ــــ سُورج کی سُرخ کرنوں تلے لہو بہتا دیکھ رہا ہوں ــــ گلاب کے کانٹے ــــ گلاب کی پنکھڑیوں کا رس بہا رہے ہیں ــــ

"ابو ــــ!"

گلاب سسکتا ہے ــــ کانٹے بکھر کر دور ہو جاتے ہیں۔

"کیا ہوا بیٹی ــــ!" بُوڑھا شخص اس سے پوچھ رہا ہے ــــ ادھیڑ عمر عورت اُس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے اور چھوٹا بھائی انکشاف کر رہا ہے ــــ

"ابو ــــ گلاب کا کانٹا چبھا ہوگا ــــ!"

مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ان گنت کانٹے میرے دل میں پیوست ہو چکے ہیں ــــ

"لائیے باجی میں رُومال سے پٹی باندھ دوں ــــ!"

میرے دل سے خون کی دھاریں بہہ نکلی ہیں ــــ جسم یوں نچڑ رہا ہے جیسے پریسنگ مشین سے جُوس نکلتا ہے ــــ اچانک لڑکا پٹی باندھنا چھوڑ کر ایک طرف دوڑتا ہے ــــ

"ابو۔ تتلی ــــ!"

تتلی ایک انار کی جُھکی شاخ پر بیٹھ گئی ہے ــــ لڑکا دھیرے دھیرے اُسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھا ــــ جونہی اس نے ہاتھ بڑھایا تتلی پھر فضاؤں میں کھو گئی ــــ

میری نظریں ساہیوال ہال کی بلندیوں کو چھو رہی ہیں ــــ چھت کے قریب زیرو پاور بلب سے ساہیوال ہال بھا ہوا ہے ــــ اچانک لڑکا اپنے باپ سے پُوچھتا ہے۔

"ابّو یہ اتنی بڑی عمارت کس لئے بنوائی گئی ہے ــــ؟"

"اس لئے کہ لوگ اس ہال میں بیٹھ کر تقریریں سنیں ــــ" باپ نے آہستگی سے اُسے سمجھایا ــــ

"ابو یہ تقریریں کیا ہوتی ہیں ــــ یہ کون لوگ سناتے ہیں ــــ" وہ پُوچھتا ہے مگر پھر اچانک اس کی نظریں تتلی پر جا ٹھہرتی ہیں ــــ جو گھاس کے تنکوں پر بیٹھ رہی ہے ــــ وہ ایک دم اُس کی طرف بڑھا ــــ مگر تتلی بیٹھنے سے پہلے ہی اڑ گئی ــــ وہ مایُوس واپس لوٹ آیا ہے ــــ

میں اکتا کر گھاس پر رکھے اُن دو گلابوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں ــــ لڑکے کی آواز پھر مجھے متوجہ کر رہی ہے ــــ

"ابو یہ عمارت کتنے روپوں میں بنی ــــ؟" باپ مُسکرا کر اُس کا چہرہ دیکھتا ہے ــــ پھر ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے کہتا ہے ــــ

"اتنا ڈھیر سارا روپیہ اس کی دیواروں میں چُنا گیا ہے ــــ"

"مگر ابو اس کا فائدہ کیا ــــ اگر میرے پاس اتنا ڈھیر روپوں کا ہوتا تو میں کبھی یہ عمارت نہ بناتا ــــ"

"تم کیا کرتے ــــ" باپ نے متجسس نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا ــــ

"میں ابو ــــ میں ان روپوں سے ڈھیر ساری رُوٹیاں خرید لیتا۔"

"روٹیاں خرید لیتا ــــ" باپ نے حیرانگی سے پوچھا ــــ

"ہاں ابو ــــ" مگر تتلی نے اس کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا ــــ لڑکا بھاگ کر اُسے پکڑنے دوڑا مگر ہر بار کی طرح اس بار پھر وہ اس کے ہاتھ نہ آسکی ــــ وہ واپس اپنے ابو کے پاس آبیٹھا ــــ

"تو بیٹے تم روپوں سے روٹیاں خرید لیتے ــــ پھر اُن کا کیا کرتے ــــ!"

"میں اُن کا ایک ڈھیر لگاتا ابو ــــ اس عمارت سے بھی اونچا ــــ"

"اچھا پھر ــــ" باپ نے جلدی سے پُوچھا ــــ

"پھر کیا ــــ" میں اس پر کھڑا ہو کر آسمان چُھو لیتا اور ــــ تتلی اس کے قریب آگئی ــــ لڑکا آہستگی سے اس کی طرف بڑھا ــــ اور اس بار وہ پکڑی گئی ــــ "آہا تتلی پکڑی ــــ" مگر تتلی اُس کے ہاتھ سے پھسل کر پھر اڑنے لگی ــــ لڑکا اداس نظروں سے اُسے دور ہوتا دیکھ رہا تھا ــــ پھر باپ کے پاس آ گرا۔

باپ نے وہی سلسلہ چھیڑتے ہوئے پُوچھا ــــ "تو بیٹے۔ تم آسمان کو چھو لیتے اور ــــ" "پھر ابو ــــ" لڑکا اداس لہجے میں اُس سمت جدھر تتلی غائب ہوئی تھی دیکھتا ہوا بولا ــــ "پھر ابو میں اللہ میاں کے پاس پہنچ جاتا اور اُس کے کان میں دھیرے سے کہتا ــــ

"اللہ میاں مجھے بھوک لگی ہے ــــ!"

اور اب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا ہے ــــ سیاہ آنچل میں لپٹا گلاب ــــ اللہ میاں سے باتیں کرنے والا لڑکا اور اس کے امی۔ ابو سبھی جا چکے ہیں ــــ اور میں تنہا گھاس کے تختے پر لیٹا سوچ رہا ہوں ــــ

کیا اب مجھے بھوک لگی ہے ــــ!

بقیہ: اظہار خیال

کے شہروں میں آباد ہوئے ہیں وہ عام طور پر دوسری زبان کی حیثیت سے سندھی پر اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔

(ب) فوجی آمروں نے اندرون سندھ کچھ غیر سندھیوں کو آباد کر دیا تھا۔

(ج) اسکولوں اور دوسری جگہوں میں سندھی زبان کے استحصال کی وجہ ایسے بہت سے غیر سندھی جو سندھی سیکھ رہے تھے۔ انہیں ۷۲، ۱۹۶۱ کے دوران سندھی زبان سیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس دوران سندھی طلباء کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اردو سیکھیں اور بے شمار بالغ سندھیوں کو کاروبار اور ملازمتوں کے پیش نظر اپنی زبان کو ترک کرنا پڑا۔

اگر ان تبدیلیوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو زبان کی تازہ ترین پوزیشن مندرجہ ذیل ہوگی۔

سندھی گو مکمل اکثریت کی مادری زبان نہیں ہے پھر بھی یہ مادری زبان کی حیثیت سے سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔

مادری زبان کی حیثیت سے سندھی اور اردو بولنے والوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے جبکہ پنجابی، پشتو بولنے والوں کے تناسب میں اضافہ ہوا ہے۔

اردو "دوسری زبان" کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوئی ہے۔ سندھی سیکھنے والوں کی تعداد اردو سیکھنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

سید محمد تقی نے غلط اعداد و شمار کے ذریعے عوام کو فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ بالآخر جماعتِ اسلامی اور دوسری فاشسٹ جماعتوں سے جا ملیں۔ پاکستان کا ہر ترقی پسند ان کے بارے میں خوب اچھی طرح سے جانتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں آئی۔ ایچ قریشی، میجر آفتاب شاہ فرید الحق، غلام اعظم فاروقی جیسے کٹر رجعت پسندوں کے ساتھ رہنے دیا جائے۔

"خاک جہاں کی ہوتی ہے، وہیں پہنچتی ہے"

آخر میں مَیں سندھ کے ان تمام لوگوں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے نام نہاد لسانی فسادات سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا۔

مہدی بن برقہ کے قاتل

جنرل اوفقیر نے خودکشی کرلی



شاہ حسن دوم



جنرل اوفقیر



مہدی بن برقہ

"میں وزیر اعظم بن گیا تو مراکش میں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہوگی" مہدی بن برقہ

وہاب صدیقی

۱۶ راگست کو ایک طیارہ بوئنگ ۷۲۰ شمالی مراکش کا ساحل عبور کرکے مراکش کی فضائی حدود میں داخل ہوا۔ اس کا رخ رباط کی جانب تھا۔ ابھی بتیون کے مقام پر پہنچا تھا کہ یکایک فضا میں کئی ایک جیٹ طیارے نمودار ہوئے۔ ان پر مراکش کی شاہی فضائیہ کا نشان تھا لیکن جس انداز سے وہ بوئنگ کی طرف بڑھ رہے تھے وہ جارحانہ تھا۔ بوئنگ کے ہواباز کی چھٹی حس نے خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے ڈبکی لگائی۔ اتنے میں جیٹ طیارے مشین گنوں سے فائرنگ کرتے ہوئے بوئنگ کے اوپر سے گزر گئے اور پھر رخ بدل کر دوبارہ بوئنگ پر حملہ آور ہوئے۔ جیٹ کے ہواباز مشین گنوں کے سوئچ دبانے والے تھے کہ بوئنگ سے ریڈیائی پروگرام وصول ہوا۔ بوئنگ کا فلائٹ انجینئر کہہ رہا تھا۔

"شاہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ باقی مسافروں کی جان بخشی کی جائے۔"

حملہ آوروں نے یہ پیغام پاکر فائرنگ بند کردی۔ بوئنگ رباط کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب رباط ایئرپورٹ پر بوئنگ اترا تو اس سے شاہ حسن، والی مراکش زندہ وسلامت برآمد ہوئے۔ شاہ کو زندہ دیکھ کر مراکش کی فضائیہ کے لڑاکا طیاروں نے راکٹ اور مشین گنوں سے گولیاں برسانی شروع کردیں۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شاہ بچ گئے لیکن ایئرپورٹ پر موجود ۸ افراد ہلاک اور ۴۰ زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں وزیر سیاحت الکوہن، وزیر تعلیم الحبیب الفہری۔ وزیر خزانہ مصطفیٰ فارس اور وزیر اسلامی امور ہادی احمد برکاش شامل ہیں۔

حملہ آور جیٹ طیاروں کو بوئنگ سے شاہ کی ہلاکت کی خبر دینے والا کون تھا۔؟ یہ اطلاع خود شاہ حسن نے دی تھی۔ ۱۷ راگست کو شاہ کے بھائی مولائے عبداللہ نے خبر رساں ادارے ڈی پی اے کے نمائندے کو بتایا کہ

"حملہ آور جیٹ طیاروں کو فضا میں بوئنگ پر فائرنگ سے باز رکھنے کے لئے شاہ حسن نے ایک چال چلی۔ جونہی ان طیاروں نے حملہ کیا شاہ حسن کاک پٹ میں پہنچے۔ اور ریڈیو کنٹرول سنبھال لیا۔ انہوں نے فلائٹ انجینئر بن کر پیغام دیا کہ شاہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ لہذا باقی مسافروں کی جان بخشی کی جائے۔"

شاہ حسن پر ناکام قاتلانہ حملہ کے بعد وزیر دفاع جنرل محمد اوفقیر نے خودکشی کرلی۔ شاہ کی وفادار فوج نے مراکشی فضائیہ کے آٹھ افسروں اور قنیطرہ کے فضائی اڈے کے کمانڈر میجر قویرہ الاوائل کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ریڈیو رباط کی اطلاع کے مطابق میجر قویرہ الاوائل کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ اپنے طیارے جیٹ الف ۵ کا ایندھن ختم ہونے کے بعد پیراشوٹ کی مدد سے اترا تھا۔ میجر قویرہ کو صرف ایک ماہ قبل قنیطرہ کے فضائی اڈے کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ رائٹر کی اطلاع کے مطابق اس ناکام بغاوت میں قنیطرہ کے تین لڑاکا طیاروں نے حصہ لیا تھا۔ مراکشی فضائیہ کے سربراہ کرنل حسن لیوسی اور فضائیہ کے دوسرے چار افسر ہیلی کاپٹر میں فرار ہوکر جبرالٹر پہنچ گئے۔ حکومت مراکش

الفتح
کراچی

عوام شاہی تسلط سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں

نے برطانیہ سے ہیلی کاپٹر سمیت پانچوں افسروں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ۱۸ اگست کو انہیں مراکش کے حوالے کر دیا گیا اور ایک ہزار فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

شاہ حسن کے خلاف یہ دوسری ناکام بغاوت ہے۔ پہلی بغاوت جولائی ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ ریڈیو اور خبر رساں اداروں نے خبر دی کہ "رباط میں بغاوت ہوگئی۔ شاہ حسن دوم ہلاک کر دیئے گئے۔ ان کے بھائی مولائے عبداللہ شدید زخمی ہیں۔ انقلابیوں نے ملک کے تمام اہم مقامات، فوجی ہیڈکوارٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن پر قبضہ کر لیا ہے۔" ریڈیو رباط سے اعلان کیا گیا "شاہ حسن دوم کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ شاہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ "جمہوریت زندہ باد، عوامی اقتدار زندہ باد" لیکن چند گھنٹوں کے بعد خبر آئی کہ "شاہ حسن دوم زندہ ہیں۔ پورے ملک کے نظم و نسق پر بدستور ان کا قبضہ ہے۔ انقلابیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ وہ فوجی کیڈٹ تھے اور انہیں دھوکا دینے کے لئے شاہ کو گرمائی محل میں بھیج دیا گیا تھا۔ بغاوت ناکام ہوگئی ہے" پھر شاہ حسن کا اعلان ریڈیو رباط سے نشر کیا گیا۔

"باغی بہت تھوڑے تھے انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے، ملک میرے قبضے میں ہے۔"

حالیہ ناکام بغاوت اور جولائی ۱۹۷۱ء کے ناکام انقلاب میں واضح فرق ہے۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں جن افراد نے شاہ حسن کا تختہ الٹنے کی کوشش کی، وہ جمہوریت نواز تھے، مراکش میں جمہوریت اور عوامی اقتدار کے خواہش مند تھے۔ وہ مراکش کو شخصِ واحد کی حاکمیت کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ لیبیا اور سوڈان میں شاہی اقتدار کا خاتمہ کر دیا گیا اور دونوں ممالک ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے تو مراکش کے عوام کو بھی نشانِ منزل دکھائی دینے لگا۔ مراکش ان انقلابی تبدیلیوں سے نہ بچ سکا۔ نتیجتاً چند فوجی افسروں نے شاہ کا تختہ الٹنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن حالیہ ناکام بغاوت میں وزیرِ دفاع جنرل اوفقیر کا ہاتھ تھا جو مراکش کے عظیم فرزند اور حریت پسند مہدی بن برقہ کا قاتل تھا۔

چھوٹی چھوٹی عقابی آنکھوں اور پتھر دل والا جنرل اوفقیر ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک بربر زمیندار کا بیٹا تھا جس کے اجداد حکومت فرانس کے وفادار تھے۔ فرانس کی فوجی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اوفقیر کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ اور ۱۹۴۱ء میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گیا۔ اس وقت مراکش میں فرانسیسی تسلط کے خلاف تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی۔ مراکش کا بطلِ حریت مہدی بن برقہ اس تحریک میں تن من دھن سے جٹا ہوا تھا۔ آزادیٔ وطن کے لئے سپاہیوں اور اسلحہ کی ضرورت تھی لیکن اوفقیر جو بنیادی طور پر زمیندار ہونے کی وجہ سے سامراج کا حلیف تھا تحریک آزادیٔ وطن میں شریک ہونے کی بجائے مراکش کے سیکنڈ ڈویژن فوج کے ساتھ اطالیہ اور فرانس میں جرمنوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ وہ دو بار زخمی ہوا۔ اور بہادری پر بارہ فوجی اعزاز حاصل کئے۔ جن میں امریکی "سلور اسٹار" اور فرانسیسی "لیجن آف آنرز" شامل تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد اس نے حکومتِ فرانس کو ہند چینی میں اپنی رضاکارانہ فوجی خدمات پیش کیں اور ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک وہ ویٹ نامی حریت پسندوں کے خلاف لڑتا رہا۔ اس کے بعد وہ رباط آ گیا۔

اوفقیر اب کیپٹن بن چکا تھا۔ رباط میں وہ کئی فرانسیسی کمانڈروں کا مصاحبِ خاص رہا۔ ان کے احکامات کی تعمیل اور ترسیل اس کی ذمہ داری تھی۔ جب اوفقیر نے محسوس کیا کہ فرانس زیادہ دیر تک مراکش کو اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔ تو اس نے مڈغاسکر میں جلاوطن شاہِ مراکش سلطان محمد سے رشتہ استوار کرنے کی کوششیں کیں۔ اور آہستہ آہستہ اس کا قرب حاصل کر لیا۔ جب مراکش آزاد ہوا اور سلطان محمد کو مراکش کا تخت و تاج سونپا گیا تو اوفقیر کے نصیب بھی جاگے۔ اسے دربارِ شاہی سے اعلیٰ خدمات کی سند عطا کی گئی اور

جیٹ طیارہ مشین گن سے شاہی طیارے پر فائرنگ کرتا ہوا گزر گیا

شاہ کا خصوصی ایلچی اور مصاحبِ خاص بنایا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں دف قبیلے نے شاہ کے خلاف بغاوت کی تو ان کی سرکوبی کے لئے ولی عہد کی کمان میں ایک فوج روانہ کی گئی۔ اوفقیر بھی اس فوج کے ساتھ تھا۔ مصدقہ خبروں کے مطابق اوفقیر نے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے دف قبیلے کے خون سے خوب ہاتھ رنگے۔ ظلم کی انتہا کر دی۔ بلکہ اس نے گرفتار باغیوں کے گلے پر بیرحمی سے چھری تک پھیر دی۔

شاہ حسن نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد بریگیڈیر جنرل بنا دیا۔ بعد میں ریاست کے حفاظتی دستے کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ پھر وزارت داخلہ کا قلمدان سونپا گیا یہ مقام اس نے جوڑ توڑ سے حاصل کیا۔ ۱۹۶۵ء تک وہ دربارِ شاہی کا مضبوط ستون بن چکا تھا۔

لیکن اتنا اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے باوجود وہ ایک شخص سے خائف تھا۔ وہ شخص مہدی بن برقہ تھا، اوفقیر، مہدی بن برقہ سے اس لئے خوف زدہ نہیں تھا کہ بن برقہ شاہ حسن کا استاد اور تحریکِ آزادی کا ہیرو تھا۔ بلکہ وہ اس لئے مخالف تھا کہ بن برقہ مراکش میں انقلابی تبدیلیاں چاہتا تھا۔ وہ عوام کا چہیتا اور بائیں بازو کے دانش وروں کا لاڈلا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "اگر میں وزیرِ اعظم بن گیا تو مراکش پر مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہو گی۔" اوفقیر نے جوڑ توڑ کر کے شاہ حسن کو جو پہلے ہی دائیں بازو کے زیرِ اثر تھے۔ مہدی بن برقہ سے بدظن کرا دیا۔

چنانچہ جولائی ۱۹۶۲ء میں دربارِ شاہی سے اعلان کیا گیا کہ "مہدی بن برقہ کی جماعت نیشنل یونین آف پیپلز پارٹی فورسز نے شاہ کے خلاف سازش کی، جو ناکام بنا دی گئی۔" اس وقت مہدی بن برقہ غیر ممالک کے دورے پر تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں انہیں موت کی سزا سنائی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں الجیریا اور مراکش کی سرحدی جنگ ہوئی۔ مہدی بن برقہ پر الجیریا کی مدد کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اور موت کا حکم سنا دیا گیا۔

مہدی بن برقہ مراکش نہیں آئے۔ کچھ عرصے قاہرہ میں مقیم رہے۔ لیکن اوفقیر اور مراکش کی سیکرٹ پولیس کے چیف لاربی ملاڈو جسے عرفِ عام میں چتوکی کہا جاتا تھا کے آدمی قاہرہ میں مہدی بن برقہ کے پیچھے لگے رہے۔ اور اسے قتل کرنے کی متعدد ناکام کوششیں کیں۔ اس پر مہدی بن برقہ پیرس چلے گئے۔ اوفقیر اور چتوکی کے آدمیوں نے یہاں بھی ان کا تعاقب کیا۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۶۵ء میں اوفقیر بذاتِ خود پیرس گیا۔ فرانس کی پولیس سے گٹھ جوڑ کیا۔ اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی رات کو "براسری لپ" ریستوران سے مہدی بن برقہ کو اغوا کر کے ہلاک کروا دیا۔

مہدی بن برقہ کے قتل نے فرانس میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ عوام نے زبردست احتجاج کیا۔ جلسے کئے، جلوس نکالے۔ صدر ڈیگال نے اوفقیر اور چتوکی کی گرفتاری کے لئے بین الاقوامی وارنٹ جاری کئے۔ مگر شاہ حسن نے اس وارنٹ گرفتاری پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تو ڈیگال نے طیش میں آ کر مراکش سے سیاسی تعلقات توڑنے کا اعلان کر دیا۔

جولائی ۱۹۷۱ء اور حالیہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مراکش شاہی چنگل سے نجات حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے تبدیلی ناگزیر ہو چکی ہے۔ اگر مراکشی عوام اگر واقعی عوامی جمہوریت کے خواہاں ہیں تو انہیں متحد ہو جانا چاہیئے۔ اپنی صفوں کو منظم اور اپنی جماعت کو مضبوط بنانا چاہیئے۔ کیونکہ اگر وہ متحد اور منظم نہ ہوئے تو شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد کوئی فوجی آمر حاکم بن جائے گا۔ یا سرمایہ دارانہ جمہوریت کا نفاذ ہو گا۔ جس سے عوام کی حاکمیت، مزدور کسان راج اور عوامی جمہوریت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

نسیم شاد





سیاست اور صحافت کے دو مسخرے

اصغر خان اور سلہری

سیاست کا صحافت سے اور صحافت کا سیاست سے بڑا گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ ایک دوسرے سے اس گہرے اور قریبی تعلق کے ساتھ ساتھ یہ دونوں شعبے ایک صفت سے بھی متعلق ہیں، جسے حماقت کہتے ہیں اور پاکستانی سیاست میں حماقت کی نمائندگی کا فرض اصغر خان اور صحافت میں زیڈ اے سلہری انجام دے رہے ہیں جس طرح اصغر خان کی تقریروں اور بیانوں میں کوئی فکر اور خیال نہیں ہوتا اسی طرح زیڈ اے سلہری کے مضامین بھی معنی و مفہوم سے عاری ہوتے ہیں ——!

سرکس اور تھیٹروں میں ان کے اہم اور بنیادی فنکاروں کے علاوہ چند مسخرے بھی ہوتے ہیں جن کا کام تماشائیوں کو ہنسانا ہوتا ہے۔ سیاست اور صحافت میں ہنسانے کا کام اصغر خان اور زیڈ اے سلہری نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ ایک تو اپنے بیانات اور تقریروں سے اور دوسرا اپنے مضامین اور تبصروں سے مسائل میں الجھی ہوئی قوم کو وقتاً فوقتاً ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اگر آپ زندہ دل نہیں ہیں اور ہنسنے ہنسانے کے معاملہ میں تحمل سے کام لینے کے عادی ہیں تو یقیناً میرے اس دعوے کے جواب میں ثبوت کا مطالبہ کریں گے اور میں اس کے لیے تیار ہوں۔

اتوار ۱۵ اگست (یعنی ۱۴ اگست کے اخبار میں ایک دن پہلے کی تاریخ دی جاتی ہے) کے "جنگ" کے صفحہ ۱۰ پر تحریکِ استقلال کی قومی مجلسِ عاملہ کے اس دو روزہ اجلاس کی کارروائی شائع ہوئی ہے جس کی صدارت اصغر خان نے فرمائی تھی اور جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ "حکومت مستعفی ہو کر اقتدار چیف جسٹس کے حوالے کر دے۔" اس اجلاس میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ "موجودہ اسمبلی پاکستان کے عوام کی خواہشات اور جذبات کی آئینہ دار نہیں" کیونکہ موئے خورشید حسن میر نے ہزاروں ووٹوں سے شکست دے کر اصغر خان پر قومی اسمبلی کے دروازے بند کر دیئے ہیں اور اس نشست پر بیٹھے مزے لوٹ رہے ہیں جس کی آرزو میں بیچارے اصغر خان نے کہاں کہاں دھکے نہیں کھائے۔ جسٹس پارٹی بنائی، پھر توڑ دی۔ پی ڈی پی میں گئے اور نکالے گئے۔ سیاست سے توبہ کی، کانوں کو ہاتھ لگائے۔ سیاسی زندگی سے کنارہ کشی کا اعلان کیا اور پھر تحریکِ استقلال کا گھروندہ بنا کر دل بہلانے گئے۔ اعلان کیا کہ ڈیڑھ اینٹ کی اس مسجد کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا مگر اس گھروندے کی کچی دیوار پر کھڑے ہو کر اپنی بے مقصد سیاست کی اذان دینے لگے۔ جب ایک مؤذن اذان دیتا ہے تو وہ بھلائی اور فلاح کی طرف بلاتا ہے اور جب ایک مرغا اذان دیتا ہے تو اس کی "ککڑوں کوں" کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اصغر خان کی سیاست مرغے کی اذان ہے یا اگر کسی ایسے مرغے کی اذان ہوتی جو وقت پر بولتا تو شاید لوگ اسے برداشت بھی کر لیتے لیکن یہ تو اب وہ مرغا بن گئے ہیں جو موقع دیکھتا ہے نہ محل! اور جب اس کا جی چاہتا ہے اچانک سے اذان دینے لگتا ہے اور بے وقت اذان دینے والے مرغ منحوس سمجھے جاتے ہیں۔

بات ہنسنے ہنسانے کی ہو رہی تھی۔ تحریکِ استقلال کے دو روزہ قومی اجلاس میں جنگ کے اسٹاف رپورٹر کی اطلاع کے مطابق "قومی اسمبلی کے نمائندہ کردار کے بارے میں بھی جائزہ لیا گیا۔" وہی مرغے کی ایک ٹانگ! اپنی نمائندہ حیثیت کا جائزہ لینے کی بجائے اصغر خان کی تحریک قومی اسمبلی کے منتخب اراکین کی نمائندگی کا جائزہ لے رہی ہے۔ مجھے تو یہ پڑھ کر یوں لگا جیسے پاگل خانے میں چند پاگل ڈاکٹروں کو پکڑ کر ان کا معائنہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہوں "ڈاکٹر صاحبان! ہمیں آپ کی دماغی حالت مشکوک نظر آتی ہے۔"

تحریکِ استقلال کے اس اجلاس میں اخباری اطلاع کے مطابق قومی اسمبلی کے قانونی وجود پر بھی غور کیا گیا اور کہا گیا کہ —— "اس اسمبلی نے عبوری آئین منظور کیا۔ جس کا اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔" کیونکہ پاکستان کے گزشتہ انتخابات میں ایک بھی نشست حاصل نہ کرنے کے بعد دستور یا عبوری دستور بنانے کے تمام حقوق قوم نے اصغر خان اور تحریکِ استقلال کو تفویض کر دیئے ہیں اور یہ اتنی بڑی اور اہم ذمہ داری ہے کہ اصغر خان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔ کبھی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور کبھی یہ مشورہ واپس لے کر بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنے کے لیے میدان میں نکل آتے ہیں۔ رہی بات قومی اسمبلی کے قانونی وجود پر غور کرنے کی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خان صاحب نے کیسے برداشت کر لی۔ وہ تو قانون اور قانونی کارروائی سے شرماتے ہیں۔ جب انہیں قتل کرانے کے منصوبے کا خود انہیں علم ہوا تو انہوں نے اس منصوبے کو "شمع معمے کے صحیح حل" کی طرح بینک میں محفوظ کرا دیا اور صدر بھٹو نے جب اس منصوبے کا پتہ چلانے کے لیے

الفتح

اصغر خان کا سیاسی مرغا بے وقت اذان دینے کا عادی ہے

جج کی نگرانی میں تحقیقات کرانے کا اعلان کیا تو خان صاحب نے گردن جھکا کر کہا ——"اوں ... اوں ، ہمیں تو جج صاحب سے شرم آتی ہے اور موا قانون تو ہمیں کڑی نظروں سے دیکھے گا ... کوئی اور بات کیجئے یہ قانون وانون ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔"

واہ، واہ! شاباش اصغر خان، واہ واہ !!! اِن

اصغر خان اور
اور زیڈ اے سلہری
پر سوشلزم
کا خوف
سوار ہے

کی سرکردگی میں ہونے والے تحریکِ استقلال کے اجلاس میں ایک اور قرارداد منظور کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ملک میں عموماً اور سندھ میں خصوصاً جو حالات رونما ہوئے ہیں۔ اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ موجودہ حکومت قابلِ قبول نہیں ہے اس لیے نئے انتخابات کرا کر عوام سے اعتماد حاصل کرنا چاہیئے"۔ کتنی زندہ دلی ہے۔ اس جماعت میں اور اس کے رہنما میں! یعنی موجودہ حکومت تو جسے عوام ناپسند کرتے ہیں جو قابلِ قبول نہیں ہے جس کی جماعت پر عوام کو اعتماد نہیں ہے وہ دوبارہ انتخاب کرا کر اعتماد حاصل کرے اور اصغر خان اور ان کی تحریک دوبارہ ہنسنے ہنسانے کا کردار ادا کرتی ہے!

یہ تو تھے سیاست کے منور ظریف، اب ذرا صحافت کے رنگیلے کا کردار ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف بڑے لمبے لمبے مضامین لکھتے ہیں لیکن یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان مضامین کے ذریعے وہ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں۔ بات کہیں سے شروع کرتے ہیں اور جا کہیں اور پہنچتے ہیں مثلاً گزشتہ اتوار یعنی ۱۴ اگست کے روز "جنگ" میں مسائل و افکار کے مستقل عنوان کے تحت ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کی سرخی ہے "ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے"

اس مضمون میں ان کے پراگندہ خیالات اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ انہیں سمیٹ کر ان سے کوئی ایک مثبت نتیجہ نکالنا کسی باشعور قاری کے بس سے باہر ہے۔ عنوان جمتا ہے اور مضمون لوٹ پٹ ہے۔

قائدِ اعظم اور قائدِ عوام، اسلام اور بنگلہ دیش، دستور اور مارشل لاء سب کچھ اس مضمون میں ہے لیکن ایک دوسرے سے اس کا کوئی تعلق کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ تو خیر ایسی کوئی خاص بات نہیں کہ اردو کے بڑے بڑے گو کہ، چونکہ، چنانچہ قسم کے خود ساختہ دانشور بھی اس بیماری کا شکار ہیں، میں تو یہاں آپ کی توجہ موصوف کے ان جملوں کی طرف دلانا چاہتا ہوں، جس میں وہ یوں ہنساتے ہیں۔ "پچھلے سات آٹھ مہینوں کی حکومتی کارروائیوں سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ قوم کی بیماری کی تشخیص میں صدر بھٹو سے چوک ہوئی۔ ایسے وقت جبکہ انہیں تمام حلقہ ہائے آراء کو دعوت شرکت دینی چاہیئے تھی۔ انہوں نے مارشل لاء جاری رکھنے پر اصرار کیا یعنی حکومت بلا شرکتِ غیرے چاہی"۔ بالکل درست ہے۔ یہ صدر بھٹو کی ایسی چوک ہے جسے قوم اور تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ایک ایسا دانشور جو ہمیشہ خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی فہرست میں سب سے آگے رہا ہو، اسے اس کے مرتبے سے ہٹا کر بھٹو صاحب نے زبردست غلطی کی ہے اور قوم کی بیماری کی تشخیص ان کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو صرف سلہری صاحب کا کام تھا اس سلسلے میں صحیح درست مشورے تو صرف وہ ہی دے سکتے تھے، جیسے ایوب خان کو دیتے تھے، شیر علی کو دیتے تھے، یحییٰ خان کو دیتے تھے۔ یہ بھٹو عجیب آدمی ہے کہ اس کو الگ کر کے بلا شرکت غیرے حکومت کرنا چاہتا ہے۔ یہ چوک نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

صحافت کے رنگیلے آگے چل کر فرماتے ہیں "جب مارشل لاء اٹھا تو عبوری آئین نافذ کر دیا"۔ بڑا ظلم کیا ہے بھٹو نے مارشل لاء اٹھا کر عبوری آئین نافذ کر دیا، اسے ملک چلانے ہی کی تو بات ہے۔ عبوری آئین کی کیا ضرورت تھی۔ سلہری صاحب کے بے معنی و مفہوم مضامین کو قانون کی صورت دے کر بھی تو ملک کو چلایا جا سکتا تھا یا پھر مارشل لاء ہی رہنے دیتے، سلہری کی نوکری پکی کر دیتے وہ اس کی حمایت میں لکھنے لگتے۔

کہتے ہیں کہ جب کسی شخص پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں تو اس کے پسِ پشت کوئی خوف پوشیدہ ہوتا ہے۔ اصغر خان اور زیڈ اے سلہری پر دراصل سوشلزم کا خوف سوار ہے۔ دونوں اس سائنٹیفک نظام کے خوف سے اکثر حراساں رہتے ہیں۔ اصغر خان اس کا بہت کم اظہار کرتے ہیں۔ لیکن سلہری صاحب صاف گوئی سے کام لے جاتے ہیں۔ مثلاً "ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے" والے مضمون میں موصوف فرماتے ہیں —— "اب لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ ملک ہے تو اقتصادی انصاف و ترقی بھی ہو سکتی ہے ورنہ سوشلزم پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے حق میں ہی مؤثر ثابت ہو سکتا ہے"۔

کون کیا کر رہا ہے؟

• —— اپنے رہنماؤں کا محاسبہ کیجئے

ہمارا سلسلہ "پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیم، عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں؟" انتہائی کامیاب رہا۔ ہم اپنے قارئین اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے انتہائی شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اپنی سچی اور دلی رائے کا اظہار کر کے الفتح کے صفحات کو وقعت بخشی۔ اب اس کامیاب سلسلے کے اختتام کے بعد ہم قارئین الفتح اور سیاسی کارکنوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ مندرجہ ذیل سوالات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ (۱) موجودہ حکومت کے وزرائے کرام میں کون کیا کردار ادا کر رہا ہے۔ کونسے وزراء پارٹی منشور کے مطابق ہیں اور کونسے مخالفت کر رہے ہیں۔
(۲) حزبِ مخالف کے رہنماؤں میں کس کا کردار وطن دوست ہے اور کون وطن دشمنی پر مبنی حرکتیں کر رہے ہیں

ذوالفقار علی بھٹو شورش کاشمیری کی نظر میں



بھٹو نے وزارت چھوڑی ہے اسلام نہیں چھوڑا

لاہور کی سینکڑوں مسجدوں میں سے چار یا پانچ مسجدوں میں جمعہ کو اس زمانہ کے جابر جعفی کی شہ پر جن وارثانِ منبر و محراب نے تاتاری رہی کی ہے اُن کے متعلق مولانا مفتی محمود صدر جمعیتہ علمائے اسلام نے اپنے بیان میں جو کہا ہے وہ ان حضرات کے لئے نہ صرف لمحۂ فکریہ مہیا کرتا ہے بلکہ اس بروقت بیان نے علمائے اجتماعی وقار کو مجروح ہونے سے بچالیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمعہ کی نماز میں ان مسجدوں کے خطیبوں نے جو کہا وہ علماء سے نوجوان پود کی ناراضی میں مزید اضافہ کا باعث ہوا ہے۔ ہمارا ماتھا پہلے ہی دن ٹھنکا تھا جب ابن الکلبی نے سٹوشہ چھیڑا اور اگلے روز اس مصرع طرح پر دو غزلہ ہوگیا حتیٰ کہ مسجدوں میں بعض خطبا نے جو ملاّ تخلص کرتے ہیں مشاعرہ رچادیا۔ چونکہ لوگ ان شرعی صورتوں کے خدوخال سے آگاہ ہیں اس لئے کسی نے ان مواعظ پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا بلکہ اکثر یہ کہتے ہوئے مسجدوں سے باہر آگئے کہ ہم لوگ ساز سننے نہیں نماز پڑھنے آئے ہیں۔ ہم پچھلے شمارہ میں بھی عرض کر چکے ہیں۔ کہ اسلام نے روایت کے اصول مقرر کئے ہیں۔ شہادت کا ضابطہ باندھ

علمائے کرام! قوم دسترخوانِ معیشت میں بھی مساوات مانگتی ہے

رکھا ہے۔ کسی مسلمان کو سیاسی اغراض کے تحت توہینِ رسالت کا مجرم کہنا ہمارے نزدیک خود ایک جرم ہے جن لوگوں نے زبانوں کو بگٹٹ کیا اور ایکا ایکی بے قابو ہوگئے وہ بلاشبہ ناموسِ رسالت کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک مسلمان کو توہینِ رسالت کا مرتکب قرار دے کر خود توہینِ رسالت کی ہے اور ان کی توہین اس لئے زیادہ احتساب کی مستحق ہے کہ انہوں نے مسندِ رسول پر کھڑے ہوکر بلا تحقیق ایک غیر ثقہ راوی کی تحریک پر ژاژخائی کی ہے۔ مولینا مفتی محمود نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ اس قسم کی حرکتوں سے علماء کے مقام کی توہین ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں شوخ چشمی کی سخت مذمت کی ہے۔

بھٹو اس اسلامی مملکت کے ایک نامور فرزند ہیں۔ انہوں نے سترہ روزہ جنگ میں اقوامِ عالم کے میدان میں پاکستان کی عظیم خدمت کی ہے۔ وہ اس مورچہ پر جس مردانگی اور قابلیت سے لڑے ہیں۔ سارا پاکستان اُن کا شکر گزار ہے۔ یہ اُس کا صلہ ہے کہ ایک شاعرانہ بھول اُن کی خطابت میں شستہ گر بتلاش کرتی اور اپنی چھپک میں بعض علماء کی لہک کو شریک کرلیتی ہے۔ افسوس ہے اُن علمائے کرام پر جو اتنے ارزاں ہوگئے ہیں کہ خواجہ حافظ کے بعض مصرعوں کی آب و تاب نمایاں ہونے لگی ہے۔ ذرا غور کیجئے اعتراض یہ ہے کہ بھٹو نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ الزام یہ ہے کہ اس طرح انہوں نے (خاکم بدہن) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

جہاں تک اعتراض کا تعلق ہے سرے سے بے معنی ہے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھٹو کی ایجاد نہیں بلکہ یہ اصطلاح اکثر اسلامی راہنما استعمال کر چکے اور کر رہے ہیں۔ خود قائدِ اعظم کے خطبات میں موجود ہے۔ انہوں نے بارہا فرمایا کہ پاکستان کا نظامِ اقتصادی اسلامی سوشلزم کی بنیاد پر ہوگا۔ علامہ اقبال کے ہاں یہ اصطلاح موجود ہے۔ صدر ایوب کئی دفعہ کہہ چکے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن جلد دوم میں سوشلزم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کو تجربہ کا موقع ملنا چاہیئے لیکن بھٹو کی زبان سے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر نہ جانے ان نازک اندامانِ شریعت کے پیٹ میں قراقر اٹھنے کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر اس اعتراض سے یہ الزام پیدا کرنا کہ توہینِ رسالت ہوئی ہے۔ ایک ایسی احمقانہ جسارت ہے کہ ہم اس تصوّر ہی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ جس رذیل نے یہ فتنہ اٹھایا اگر وہ اسلام کی نمائندہ ہے اور جن لوگوں نے اس لقمہ کو منہ میں ڈال کر جھنگارنا شروع کیا۔ اُن کا وجود اسلام کا ترجمان ہے تو عجب نہیں آئندہ پود اسلام سے بغاوت کردے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پڑھا لکھا شخص بھی لاہور میں ایسا نہیں ملا جس نے ہاتھیوں کے اس غول کو قابلِ اعتنا سمجھا ہو۔ بھٹو نے وزارت چھوڑی ہے اسلام نہیں چھوڑا۔ ہمیں اس پر قطعاً اعتراض نہیں کہ اُن کی جماعت اور اُن کے سیاسی موقف پر تنقید ہو۔ یہ ہر شخص کا جمہوری حق ہے۔ لیکن ہم اس کے سخت خلاف ہیں کہ رسولؐ کے ناموس کو درمیان میں لایا جائے اور اس پر اس طرح کا غوغا ہو۔ یہ بجائے خود اہانتِ ناموسِ رسالت ہے۔ ہم جیسا عاجز کانپ اٹھتا ہے۔ جب یہ تصوّر آتا ہے کہ لغات النساء کا ایک محاورہ ناموسِ حضورؐ کی آڑ میں جو کڑی بھر رہا ہے۔ آخر قیامت کے روز ہم اپنے آقا و مولا (فداہ امی وابی) کے روبرو پیش ہوں گے تو کس منہ سے ہوں گے۔ یہ منہ ہے کہ کر روٹ پر منٹوں کی آبرو میں اضافہ کرنے کے لئے ہم نے حضورؐ کی آبرو کا سہارا لیا تھا۔ یہ ایک ایسا تصوّر ہے کہ روح تھر تھراتی ہے۔ کیا حضورؐ کے نام کو اس طرح استعمال کرنے والوں کی پگڑی ورق بٹھائی جاسکتی ہے؟ سوالات ذہن میں ایک نہیں بے شمار ہیں۔

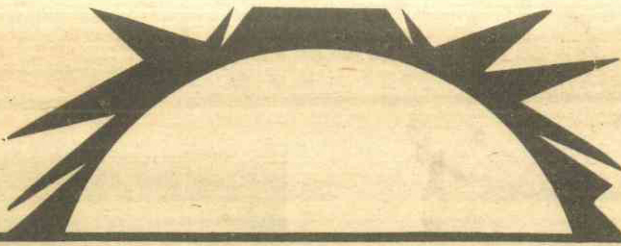
بنیادی سوال یہی ہے کہ جن علماء کو بھٹو کا سوشلزم خلافِ اسلام محسوس ہوا انہیں سرمایہ داری کا عفریت نظر نہیں آتا؟ انہیں تعلیماتِ اسلامی کے زخم محسوس نہیں ہوتے؟ انہیں یہ معلوم نہیں کہ فواحش کا زور بندھا ہوا ہے۔ ایک نہیں سینکڑوں چیزیں خلافِ اسلام ہیں۔ پھر ان کے خلاف ان وارثانِ منبر و محراب کی زبانیں کیوں گنگ ہیں؟ کیا ہم انہیں صرف اس لئے اسلام کا ٹھیکیدار سمجھ لیں کہ جوشؔ کے الفاظ میں حوروں کے شوہر ہیں عمامہ بر سر مسواک در جیب ہیں اور اٹنگا پاجامہ دلق در بر ہیں۔ کیا چہروں کو سنت کے مطابق ہی بنانا عینِ اسلام ہے پیٹ کو سنت کے مطابق بنانا اسلام نہیں؟ کتنے ہیں جو اپنی بیٹیوں کو جہیز میں مٹی کا گھڑا، چمڑے کا مشکیزہ اور پتھر کی چکی دیتے ہیں؟ کتنے ہیں جن کے مکان کچے

ہیں۔ کتنے ہیں جو پیٹ پر پتھر باندھ سکتے ہیں کتنے ہیں جن کے گھروں کا چولہا کئی کئی دن بجھا رہتا ہے، کتنے ہیں جو فاقہ کرتے ہیں کیا یہ سنتِ رسول نہیں؟ سنتِ رسُول صرف داڑھی رکھنا عطر لگانا۔ کاجل سجانا اور اونچے پائنچے کا پاجامہ پہننا ہی ہے؟ کیا ان کی پرسش نہ ہوگی۔؟ کیا ان سے خدا یہ نہ پُوچھے گا کہ تم نے دستر خوانوں کے تنوع پر کلام اللہ کو اٹھا رکھا۔ تم نے غریب کے جنازے میں عجلت کی اور امیر کے جنازے میں کلام اللہ اس طرح پڑھا گویا کتاب اللہ ابھی نازل ہو رہی ہے۔ تم کس سنت کے مطابق مرغِ مسلّم اور پراٹھے کھا کے رسول اللہؐ کے فاقوں کا ذکر کرتے ہو۔ تمہیں منبر و محراب کی حیا نہیں؟ گنبدِ خضریٰ کی شرم نہیں؟ تم اپنے کاندھوں پر شال رکھ کر رسُول اللہؐ کی پھٹی ہوئی کملی کا ذکر کرتے ہو۔ علمائے حق بتائیں کہ ٹیلی ویژن پر سیرتِ رسُول سنا کر پیسے کھرے کرنا شرعاً جائز ہے؟ یہ کہنا کہ رسولِ اللہؐ فتح مکہ کے وقت اونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھے اور خود موٹروں پر اڑے پھرنا سُنت ہے؟ حضُورؐ کے گاڑھے کا ذکر کرنا اور خود بدن پر ڈیکرون کی اچکن پہننا اتباعِ سیرت ہے۔؟ جب تمہارے گھروں میں سنتِ رسُول کا سایہ تک نہیں اور جب تمہاری اپنی زندگی میں سیرتِ رسُول کا پرتو تک نہیں پھر تم کس مُنہ سے کہتے ہو کہ مسندِ رسول کے وارث ہو اور نیابتِ رسُول کا فرض ادا کر رہے ہو۔ اسلام کو سرمایہ داری نے اتنا بڑا زخم لگایا ہے کہ تم اس زخم کو دیکھ نہیں سکتے، تمہیں معلُوم نہیں کہ سرمایہ و محنت کی کشمکش کیا ہے؟ تم میں سے کون ہے جو رات کو حضُورؐ کی طرح اس اضطراب میں نہ سوتا ہو کہ ایک اوقیہ چاندی پڑی تھی۔ تم میں سے کتنے ابوبکرؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ کس نے کہا کہ مجھے پُرانے کپڑوں میں دفنا دینا۔ نیا کپڑا زندوں کے لئے ہوتا ہے کتنے فاروقؓ کی مانند ہیں کہ لوگوں کے دروازوں پر دستک دے کر اُن کا حال پوچھیں؟ کتنے عثمان غنیؓ کی سخاوت رکھتے ہیں۔ کتنے علی مرتضےٰؓ کے پیرو ہیں کہ اپنے غلاموں کو ریشم پہنا سکیں اور خود گاڑھا پہنیں۔ سنتِ رسُول یہ ہے یا وہ جو تم نے وضع کر لی۔

علمائے کرام یاد رکھو قوم مسجد کی صفوں پر مساوات نہیں چاہتی وہ دستر خوانِ معیشت میں بھی مساوات مانگتی ہے یہی سوشلزم ہے۔ جس کا اعلان کیا جا رہا ہے اور جس سے اب کوئی شخص روکنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ تم اپنے قول سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ حضور کو بالواسطہ ان کا نمائندہ کہہ کر غریب الحال امّت کی اہانت نہ کرو۔ تمہاری یہ گستاخی ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے غریبوں نے رسُول اللہؐ کے ناموس پر جانیں دی ہیں۔ تم میں سے کبھی کوئی شخص عزت مند ثابت نہیں ہوا۔ محض حضُورؐ کے نام پر روٹیاں توڑنا تمہارا شعار ہو گیا ہے۔

بشکریہ ہفت روزہ "چٹان" لاہور

جلد-۲۱- شمارہ ۷۵- ۱۲، فروری ۱۹۶۸ء



سُنہرا سورج

ہمیں دعا دو
کہ ہم نے تم کو
سُنہرے لمحوں کے پھُول بخشے
سُنہرے خوابوں کی روشنی دی
سُنہرے سُورج کا تاج بخشا
سُنہری بستی کا راج بخشا

ہمیں دعا دو
کہ ہم تمہارے
انیسِ جاں تھے
شریکِ غم تھے
رفیق و ہمدم تھے، ہمقدم تھے
ہم آج بھی ہمقدم ہیں لیکن
تمہاری نظریں بدل گئی ہیں
یہ المیہ ہے !!

احمد رئیس

الفتح

واقفِ حال کے قلم سے

ملک میں سیاسی استحکام نہ ہُوا تو بیرونی معاہدے بے اثر رہیں گے



مُلک کے ہر کونے میں "پاکستانائزیشن" کے عمل کی ضرورت ہے

معاہدہ شملہ کو دنیا بھر نے صدر بھٹو کے تدبر کا عملی مظاہرہ قرار دیا۔ ویسے بھی بھارت کا اس معاہدے سے پہلے جو رویہ تھا اس کے پیشِ نظر معاہدہ شملہ کی محدود کامیابی بھی پاکستان کے لئے بڑی کامیابی ہے۔ اس میں ٹھوس اور عملی حقیقت پاکستان کو تین تحصیلوں کی واپسی ہے۔ باقی تمام باتیں اصولی اور تجریدی باتیں ہیں۔ جنگ سے پرہیز، طاقت کے استعمال سے گریز، ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ بند، دوسرے مسائل اور تجاویز اصولی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی عملی یا مادی شکل کوئی نہیں ہے۔ نقد ہاتھ آنے والی چیز تین تحصیلیں ہیں۔ معاہدہ شملہ میں جس تدبر کا مظاہرہ صدر بھٹو نے کیا۔ وہ اپنی طرف مگر اندرونی مسائل پر ان کے اپنے قریبی اور معتمد ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے ان کی بیرونی ملکوں میں کی گئی تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اگر باہر بھی افسروں کے ناکام ہو جانے پر خود صدر بھٹو کو آگے آکر مذاکرات کا جمود توڑنا پڑتا ہے اور اندرونِ ملک بھی ہر مسئلے پر صدر مداخلت نہ کریں تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس طرح کام کیسے چلے گا۔ یوں تو سارے اختیارات، ساری طاقت بھی صدر بھٹو کی ذات میں جمع ہو گئی اور اس طرح ساری ذمہ داریاں بھی ایک واحد ذات پر آ پڑی ہیں۔ یوں نہ اندرونی مسائل نبٹ سکے ہیں اور نہ صدر بھٹو بیرونی مسائل کی طرف پوری توجہ دے سکیں گے۔

معاہدہ شملہ کا مقصد صرف بیرونی سطح پر اپنے مفادات کا تحفظ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے اندرونی طور پر سیاسی استحکام بھی مقصود ہے۔

بھارت سے مذاکرات کے لئے ہماری طرف سے اہم ترین مسائل کی ترتیب یہ تھی۔

(۱) سرحد پر کشیدگی کی حالت کا خاتمہ اور مقبوضہ علاقوں سے فوجوں کا انخلاء۔

(۲) جنگی قیدیوں کی رہائی۔

(۳) مسئلہ کشمیر کا حل۔

بنگلہ دیش کے سلسلے میں پاکستان کا موقف یہ تھا کہ اس کے لئے بھارت کی سرزمین پر بات نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بھٹو نے مجیب سے ملاقات کے سلسلے میں بھی یہی کہا تھا کہ دنیا کے کسی کونے میں بھی ہو سکتی ہے۔ بھارت کی سرزمین پر نہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے، کہ راولپنڈی میں افسروں کی سطح پر ملاقات میں پاکستان نے اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ سربراہ کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن اور اُن کے وفد کو بھی بلا لیا جائے۔ تاکہ جنگی قیدیوں کے سلسلے میں اگر کوئی پیچیدگی پیدا ہو تو اس وقت بات ہو سکے۔ مگر شیخ مجیب نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ انہوں نے پہلے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی شرط عاید کی۔

پاکستان پہلے مسئلے کے حل میں تو کامیاب ہو گیا کہ سرحدوں پر کشیدگی کا خاتمہ ہو جائے۔ مقبوضہ علاقوں سے فوجوں کا انخلاء ایک ماہ تک مکمل ہو جائے گا۔ اس ایک نکتے کے لئے بھی پاکستان اور بھارت میں کافی کشمکش ہوئی۔ اخباری اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت کی حکومت، اخبارات اور سیاسی رہنما ——— پاکستان کے جنگی قیدیوں اور ۵ ہزار مربع میل رقبے کے اپنے ہاتھوں میں ہوتے ہوئے چاہتے تھے کہ اس وقت تمام مسائل طے کر لئے جائیں۔ اسے "مجموعی سودے" کا نام دیا جا رہا تھا۔ بھارت کے نزدیک کشمیر کا مسئلہ سب سے اہم تھا وہ پاکستان کی اس نازک حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کشمیر کی عارضی جنگ بندی لائن کو مستقل سرحد تسلیم کروانا چاہتا تھا۔ انتہا پسند سیاسی رہنماؤں کا اصرار بھی یہی تھا۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش کو فوری طور پر تسلیم کرنا ——— جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنا ——— اپنی فوجوں میں کمی کرنا ——— بھی منسلکہ شرائط تھیں ——— بار بار کے تعطل کے بعد بالآخر صدر بھٹو اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کا اس نتیجے پر پہنچنا ——— سیاسی تدبر کی ایک مثال ہے ———

اس معاہدے سے آئندہ مذاکرات کی بنیاد پڑ گئی ہے دونوں سربراہ پہلی بار مل بیٹھے ہیں اور براہ راست انہوں نے مسائل کو حل کرنے کا آغاز کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ دوسرے مسائل پر بھی پُرامن انداز میں بات چیت ہو گی۔ اس وقت دونوں ملکوں کے عوام امن چاہتے ہیں، کیونکہ ماضی کی جنگوں نے دونوں ملکوں کے عوام کو کچھ نہیں دیا۔ بیرونی طاقتوں کی شہ پر حکمران ٹولوں کی ان جنگوں نے عوام کو صرف ایندھن کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان میں کوئی جنگ بھی عوام کی جنگ نہیں تھی، کیونکہ یہ جنگیں جن مقاصد کے حصول کے نام پر لڑی گئیں، ان کو حاصل کئے بغیر درمیان میں ہی ختم کر دی گئیں۔ اس لئے خواہ مخواہ جنگ کا ایندھن بننے سے کیا فائدہ ———؟

یہ مذاکرات سربراہوں اور افسروں کی سطح پر ہوتے رہیں گے۔ اور ممکن ہے یوں بتدریج مسائل حل بھی ہوتے رہیں۔ لیکن

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

خوش رنگ سویرے کی اُمید خاک میں مل گئی

ریاض الدین زاہد صدر پیپلز پارٹی حلقہ لبستی کمہاراں ۔ ملتان

پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہمارا تاثر یہ تھا کہ اب تاریکی کے بادل چھٹ جائیں گے، خوش رنگ سویرا ہوگا کوئی چھوٹا نہ بڑا ہوگا، ظالم ہوگا نہ مظلوم ہوگا، گھر گھر خوشیوں کا بسیرا ہوگا۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد جاگیرداروں کے ظلم بڑھ گئے۔ اس کے مصداق ——— "سیاں مورے کوتوال اب ڈر کاہے کا!"

وہ کارکن جنہوں نے پارٹی کو کامیاب کرانے کے لیے دن رات محنت کی، جانی اور مالی قربانیاں دیں، بالکل غیر محفوظ ہو گئے۔ جو موقع پرست تھے وہ آگے آکر خود کو پارٹی کے وفادار کہلانے لگے جس کی وجہ مخلص کارکن پیچھے ہٹ گئے اور مخالف پارٹیاں موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر آگے آنے کی کوشش کرنے لگی ہیں۔

۲: ——— عوام نے پارٹی سے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں ایک ایک کر کے دم توڑ گئیں۔ نہ وہ ہزار سال تک جنگ کا تصوّر رہا نہ ہی کشمیر کی آزادی کا وہ جوش! نہ ہی جاگیرداروں کی جاگیریں چھیننے کا خیال اور نہ ہی ملوں، کارخانوں کو قومی ملکیت کا جذبہ! عوام پر گولی جو کل چلتی تھی آج بھی چل رہی ہے

۳: ——— پارٹی کی قیادت اور کارکنوں میں کچھ خلا تو اس وقت پیدا ہو چکا تھا جب انتخابات میں پارٹی کامیاب ہو گئی تھی۔ جو کچھ رابطہ باقی رہ گیا تھا وہ پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ختم ہو گیا۔ غریبوں کی بات کرنے والوں کو روسی اور بھارتی ایجنٹ اور ملک دشمن کہا جانے لگا۔ صحیح بات کرنے والے کو پارٹی منشور کے خلاف بات کرنے کی وجہ بنا کر نکالا جانے لگا۔ حال ہی میں مزدور رہنما محمود نواز بابر جو مزدور دوستی، عوام دوستی، کسان دوستی کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں، جنہوں نے الیکشن لڑنے کی بجائے عوام میں رہنے کو ترجیح دے کر ٹکٹ نہیں لیا تھا اور جن پر مخلص کارکن اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، سرمایہ داروں، جاگیرداروں کے الٹے سیدھے چکروں کا نشانہ بنے اور غلام مصطفےٰ کھر نے اپنی ذاتی رنجش کی وجہ سے پارٹی آئین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ان کی رکنیت معطل کر دی۔ اس پر ملتان کے کارکنوں نے بے شمار ٹیلی گرام بھٹو صاحب، کھر صاحب، شیخ رشید صاحب کو روانہ کیے مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نتیجتاً پیپلز پارٹی ملتان کا صدر دفتر ویران ہو گیا۔ کارکنوں کے دل ٹوٹ گئے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جس شخص نے پارٹی کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہ کی جس کو چیئرمین بھٹو ملتان کا شیر کہا کرتے تھے کیونکہ فیروز دین انصاری کے پارٹی چھوڑنے اور مولانا حامد علی خان کے سیاست میں آنے کے بعد ملتان کی پارٹی مردہ لاش کی مانند تھی لیکن محمود نواز بابر کی قربانیوں نے کارکنوں میں پھر وہی جوش پیدا کیا جو شکست خوردہ فوج میں ایک باہمت کمانڈر کے آنے کے بعد آجاتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ آپ جانتے ہی ہیں۔ ملتان میں انتخابات کی کامیابی کا سہرا محمود نواز بابر کے سر ہے۔

۴: ——— سرکاری عہدوں پر جانے کے بعد رہنماؤں نے کارکنوں سے رابطہ ختم کر کے کرسیوں سے رابطہ جوڑ لیا ہے خود غرضیوں کو اپنا لیا ہے۔ عوام کی بات کرنے والے کرسی کی بات کرنے لگے ہیں۔

۵: ——— کارکنوں کا اتحاد اسی وقت قائم ہو سکتا ہے۔ جب ہائی کمان پرانے کارکنوں کو ترجیح دے۔ نئے آنے والے مفاد پرستوں کو چار آنے کے ممبر ضرور بنائیں۔ لیکن اگلی صفوں میں جگہ نہ دی جائے۔ از سرِ نو انتخاب کرا کے پرانے اور مخلص محنتی کارکنوں کو آگے لایا جائے اور سیاسی شعور رکھنے والے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۶: ——— بااثر افراد پہلے کی طرح اب بھی اسی روش پر ہیں۔ وہی اسمگلنگ کا کاروبار، سفارشات سے کام لے کر اپنی اور نوکر شاہی کی جیبیں بھر رہے ہیں۔

۷: ——— پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیے تاکہ حکومت کوئی غلط اقدام نہ کر سکے۔

۸: ——— یہ سب بہتان ہے۔ مخلص عوام کے خیر خواہ کارکن، جنہوں نے رشوت کو ختم کرنے کے لیے مؤثر قدم اٹھائے تھے ان پر ایسے حربے استعمال کر کے نوکر شاہی کے ایجنٹ غریب عوام کو لوٹنے کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہیں تاکہ مخلص کارکن راستہ سے ہٹ جائیں اور غریب عوام کو جی بھر کے لوٹیں۔

عوام نئی تحریک کا آغاز کریں

ڈاکٹر ایم اے قیوم اعوان
سیکرٹری پیپلز پارٹی میرپور خاص

۱۔ پاکستان پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آنے کے بعد عملی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف ہڑبونگ ہے جو چل رہا ہے۔ کیونکہ اقتدار میں آنے کے بعد تمام موقع پرست وڈیرے، سرمایہ دار جنہوں نے الیکشن کے وقت اور اس سے قبل سخت مخالفت کی تھی اب طاقت کے بل بوتے پر وہ پارٹی میں شامل ہو چکے ہیں۔

۲۔ عوام کو اور خاص کر غریب عوام اور درمیانے طبقہ کو پیپلز پارٹی سے کسی قسم کی توقعات وابستہ رکھنا غلطی ہوگی اور مزید اپنے آپ کو دھوکا دینا ہوگا۔

۳۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کا واسطہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ البتہ موقع پرستوں کا رابطہ ضرور قیادت کے ساتھ ہے جو شکر کے ڈپو سے لے کر اور دوسرے طریقوں سے مطلب براری کر کے پیٹ پال رہے ہیں۔

۵۔ کارکنوں اور ممبروں کے لئے جو کہ نیک تمنائیں رکھتے ہیں میری تجویز یہ ہے کہ وہ اپنا الگ حلقہ بنائیں اور یہ دیکھیں کہ وہ جس کی قیادت میں کام کر رہے ہیں وہ کہیں بہت بڑا زمیندار تو نہیں، جاگیردار تو نہیں، سرمایہ دار تو نہیں۔ کراچی پی سی ایچ کے کسی بڑے بنگلہ میں تو نہیں رہتا۔ اس کا کردار عوام میں کیا ہے۔ اس کے نظریات کیا ہیں اس کا منشور کیا ہے۔ ایک الگ اپوزیشن بنا کر پھر نئے سرے سے تحریک کا آغاز کریں اور اپنے آپ کو ملکی سطح پر منظم کریں۔

۶۔ بعض موقع پرست لوگ سرکاری افسران سے کام کرانے

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

ٹنڈوالہ یار

مہران شوگر ملز کی انتظامیہ نے نوکر شاہی کو بھی مات کردیا

نسیم شاہ

مہران شوگر ملز شکر سازی کی صنعت کا ایک عظیم ادارہ ہے جس پر تقریباً چار کروڑ روپے کی لاگت آئی۔ اس ملز کی روزانہ پیداوار ۱۵ سو سے دو ہزار ٹن ہے۔ پاکستان میں شکر سازی کے کارخانوں میں اس کا درجہ تیسرا ہے۔ اس ملز کے چیئرمین اور ڈائریکٹروں کی اکثریت سیاست دانوں اور جاگیرداروں پر مشتمل ہیں۔ اس کے چیئرمین قومی اسمبلی کے رکن ہیں۔ تین ڈائریکٹروں میں سے ایک قومی اسمبلی اور دو صوبائی اسمبلی کے رکن ہیں۔ سیاست اور حکومت اُن کے گھر کی باندی ہے ویسے بھی سرمایہ دار اور جاگیردار خود کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہے۔ محنت کشوں کا استحصال اس کا فریضہ ہے۔ سو مہران شوگر ملز کی انتظامیہ بھی اپنے مزدوروں کا استحصال کرنے میں کسی سے کم نہیں۔ اس ملز کے محنت کشوں کو وہ حقوق اور مراعات بھی نہیں دی گئیں جن کی اجازت قانون دیتا ہے اور تحفظ کرتا ہے۔

اس ملز میں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری ہے۔ کوڈوپائرین، اے۔پی۔سی، اسپرو، سلفاڈائزین اور مکسچر کے علاوہ اور کوئی دوائی اس ڈسپنسری میں نہیں ہوتی۔ مرض خواہ کچھ ہے یہی مکسچر اور گولیاں ہر مرض کا علاج سمجھی جاتی ہیں۔ افسروں اور محنت کشوں کے علاج میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ افسروں کو عمدہ، اچھی اور مزدوروں کو سستی اور ناقص دوائیاں دی جاتی ہیں۔ ڈاکٹروں کو انتظامیہ کا حکم ہے کہ مزدوروں کے علاج پر کم سے کم روپیہ خرچ کیا جائے۔ اب ڈاکٹر کی کیا مجال کہ وہ حکم عدولی کرے۔ ملز میں لیڈی ڈاکٹر یا مڈوائف کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ کیونکہ مزدوروں کی بیویوں اور بچوں کو اس ملز میں طبی سہولتیں نہیں دی جاتی ہیں اور نہ ہی میڈیکل بلوں کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ ملز میں ایمبولینس نہیں ہے صرف ایک ویگن ہے جو اکثر و بیشتر افسران کے مصرف میں رہتی ہے جس کی وجہ سے ایمرجنسی کے وقت کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ملز کی کینٹین تنگ اور تاریک ہے۔ بالکل بھٹیارے کی دکان معلوم ہوتی ہے۔ کھانا اور دیگر اشیائے خوردنی نہایت ناقص اور بے کار ہونے کے باوجود بہت مہنگی دی جاتی ہیں۔ انتظامیہ نے درحقیقت کینٹین کو ذریعہ منافع بنالیا ہے۔ حالانکہ نئے لیبر قوانین کے مطابق ملز کی کینٹین کسی نفع یا نقصان کی بنیاد پر چلنی چاہیئے۔ کینٹین میں بیٹھنے کا انتظام بھی صحیح نہیں ہے۔ چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں جن پر گرد و غبار اور میل کی موٹی تہہ صاف نظر آتی ہے۔

انتظامیہ نے پاکستان کی نوکرشاہی کو بھی مات کردیا ہے۔ ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ خواہ کتنا بھی ضروری کام کیوں نہ ہو، مقررہ وقت سے پہلے یا بعد میں انتظامیہ کے افسروں سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ جنرل منیجر سے ملنے کے لئے مزدوروں کو پہلے اپنے شعبہ کے سربراہ سے اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ جنرل منیجر نے ملاقات کا وقت ایک بجے سے دو بجے دوپہر یعنی ایک گھنٹہ رکھا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہی وقت مزدوروں کے وقفہ آرام اور کھانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اس طرح سے مزدوروں کا وقفہ آرام جنرل منیجر کی ملاقات کی نذر ہو جاتا ہے۔

موجودہ لیبر قوانین کے مطابق مزدوروں نے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کی اپیل پر ایک ورکس کونسل بنائی تاکہ محنت کشوں کے مسائل انتظامیہ اور مزدوروں کے نمائندوں کی باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل کئے جائیں لیکن انتظامیہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہی ہے اور ورکس کونسل کے مشوروں پر بالکل عمل نہیں کیا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے محنت کشوں میں بے چینی اور اضطراب پھیل رہا ہے۔

کراچی

پروگریسو لائیرز فورم کا قیام

کراچی میں ہم خیال وکیلوں کی ایک خصوصی نشست میں ملک کی موجودہ سیاسی اور سماجی صورتِ حال پر غور و خوض کیا گیا اور طے کیا گیا کہ دانشوروں کی حیثیت سے وکیلوں کے لئے یہ وقت نہایت اہم ہے۔ لہذا فیصلہ کیا گیا کہ وکیلوں اور قانون دانوں کو ترقی پسند خطوط پر سوسائٹی کی تعمیر و ترقی اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا حصہ ادا کرنا چاہیئے۔ اس خیال کے پیش نظر اسی میٹنگ میں "پروگریسو لائیرز فورم" کے نام سے ایک ایسے ادارے کی تشکیل کی گئی۔ جس کے ذریعہ وکالت کے پیشے سے تعلق رکھنے والے ترقی پسند اور باشعور قانون دان اپنے خیالات و تصورات کا اظہار کریں اور ملک و قوم کی تعمیر میں اپنا تاریخی کردار ادا کریں۔

یہ ادارہ کل پاکستان کی بنیاد پر ہوگا۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

ا۔ ملک میں عوامی جمہوریت کے قیام اور قانون کی حکمرانی کے لئے جدوجہد کرنا۔

ب۔ عوام کے سول حقوق کی بحالی۔

ج۔ عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ۔

د۔ عوام کو علاقہ واریت اور ذاتی فائدے کی سوچ سے چھٹکارا دلانا۔

س۔ ایک قوم کی حیثیت سے عوام میں اتحاد پیدا کرنا۔

ش۔ عوام کے تضادات کو جمہوری طریقہ سے حل کرنا۔

ص۔ ہر مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے طبقات کے درمیان دوستی اور خیرسگالی کے جذبات پیدا کرنا۔

ض۔ عوام کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر نظم و ضبط کے ساتھ آزادی کی روح کو برقرار رکھنا۔

ط۔ عوام کی معاشی، سیاسی اور سماجی آزادی اور خوشحالی کے لئے جدوجہد کرنا۔

فورم کو چلانے کے لئے ۱۲ رکنی کنوینر کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مسٹر ایم اصغر لغاری، حسن اصغر رضوی اور سید احمد فاروقی کو چیئرمین، وائس چیئرمین اور سیکرٹری کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔

کھپرو

صحافیوں کو قتل کی دھمکیاں دی جارہی ہیں

محمد رحیم کمبھار

صحافت ایک مقدس پیشہ ہے۔ اس کا مقصد عوام کو اطلاعات فراہم کرنا، رہنمائی کرنا، عوام دشمن سرگرمیوں اور نوکر شاہی کا پردہ چاک کرنا ہے۔ کھپرو کے صحافی اسی مقصد کو

سرانجام دیتے ہیں۔ افسر شاہی کی بدعنوانیوں کی نشان دہی کرتے ہیں، عوامی مسائل کے حل پر زور دیتے ہیں یہی بات کھپرو کے حکام کو ناگوار گذرتی ہے۔ اسی بات پر کھپرو کے وڈیرے صحافیوں سے ناراض ہیں۔ قتل اور نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ گزشتہ دنوں نمائندہ عبرت اور انجمن صحافیان کھپرو کے صدر حاجی کھجو خان نے نہری پانی کی ناجائز تقسیم کے بارے میں ایک خبر اپنے اخبار میں شائع کرائی۔ اس پر انہیں سومرو خان نے نقصان پہنچانے کی دھمکی دی۔ اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے انجمن صحافیان کھپرو کا ایک ہنگامی اجلاس بلوایا گیا۔ جس میں اس بات کی مذمت کی اور کہا گیا کہ صحافیوں کو نقصان پہنچانے اور قتل کرنے کی دھمکیاں محض اس لئے دی جارہی ہیں کہ وہ افسروں کی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ اجلاس میں اتفاق رائے سے اس بات کا عزم کیا گیا کہ صحافی ہر حال میں آزادیٔ صحافت کو برقرار رکھیں گے اور عوامی مفادات کا تحفظ کریں گے۔ قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ صحافیوں کو تحفظ فراہم کرے۔

تحصیل کھپرو کے دیہی علاقے میں اچانک چوری کی وارداتوں میں اضافہ ہوگیا۔ ہر رات کسی نہ کسی جگہ چوری کی واردات ضرور ہوتی ہے۔ اس سے ہاریوں اور کسانوں میں سخت بے چینی اور اضطراب پھیل رہا ہے۔ وہ پریشان ہیں کہ وہ کیا کریں کیونکہ ابھی تک کوئی مسروقہ مال برآمد نہیں ہوا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ہاری دن کے وقت کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور رات کو پہرہ دیتے ہیں۔ تھانوں میں رپورٹیں درج ہیں۔ لیکن ابھی تک پولیس چوروں کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔

نوشہرو فیروز

ٹاؤن کمیٹی والے خاکروبوں کو انسان نہیں سمجھتے

علی احمد میمن

نوشہرو فیروز سندھ کے قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے تاریخی رشتے کلہوڑا حکمرانوں سے ملتے ہیں۔ اکثر مکانات پکی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں۔ اس کی ٹاؤن کمیٹی کی آمدنی بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر کمیٹی کے ارباب اقتدار چاہتے تو اس آمدنی سے اس تاریخی شہر کو خوب صورت اور جدید ترین شہر بنا سکتے تھے۔ لیکن ٹاؤن کمیٹی کے حکام اتنے زیادہ بااختیار ہیں کہ آج تک انہوں نے شہریوں کے مسائل اور مطالبات پر کوئی توجہ نہیں دی۔

تقریباً تین چار سال قبل نوشہرو فیروز کے چند سماجی کارکنوں نے اس وقت کے چیئرمین ٹاؤن کمیٹی پیر تراب علی مرحوم سے مطالبہ کیا کہ شہر کی گلیاں پکی کی جائیں۔ پکی مارکیٹ اور ایک پارک بنایا جائے نوشہرو فیروز کی پیپلز پارٹی نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین اور دیگر حکام نے اس مطالبہ پر کوئی توجہ نہ دی۔ حکام کی اس سرد مہری کے جواب میں پیپلز پارٹی نوشہرو فیروز کے جنرل سیکرٹری علی احمد نے بھوک ہڑتال کردی اور اعلان کیا کہ جب تک عوامی مطالبات تسلیم نہیں کئے جاتے اس وقت تک بھوک ہڑتال جاری رکھوں گا۔

جناب علی احمد کے اس اقدام نے عوام میں جوش و خروش پیدا کردیا۔ بے چینی اور اضطراب بڑھنے لگا۔ ٹاؤن کمیٹی کے ارباب اقتدار کو اپنے اقتدار کی کشتی ڈوبتی نظر آئی۔ چنانچہ انہوں نے مطالبات تسلیم کرلئے۔ گلیاں پکی ہوگئیں۔ پارک بھی بن گیا۔ نئی پختہ مارکیٹ بھی تعمیر ہوگئی۔ اس کے علاوہ ٹاؤن کمیٹی نے اور کوئی خاص کام نہیں کیا۔ نوشہرو فیروز کے عوام پوچھتے ہیں کہ ٹاؤن کمیٹی کی آمدنی کہاں صرف ہورہی ہے۔

خاکروبوں کے ساتھ ٹاؤن کمیٹی کے حکام کا رویہ اور سلوک بہت خراب ہے۔ انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ بلا جواز اور کوئی وجہ بتائے بغیر ملازمت سے برطرف کردیا جاتا ہے۔ چھٹیاں نہیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ خاکروبوں کی یونین، لوکل کونسلز ورکرز یونین رجسٹرڈ نے صوبائی وزیر لوکل باڈیز جناب جام صادق علی سے ٹاؤن کمیٹی کی بدعنوانیوں کی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے اور ٹاؤن کمیٹی کے ارباب اقتدار پر بڑے سنگین الزامات لگائے ہیں۔ چند الزامات درج ذیل ہیں۔

- تنخواہ کے رجسٹر میں بعض جعلی خاکروبوں کے ناموں کا اندراج کرکے حکام خود تنخواہ وصول کرتے ہیں۔
- جعلی بل بناکر ادائیگی وصول کی جاتی ہے۔
- خوشامدیوں اور پٹھوؤں کو ناجائز اور غیر قانونی طور پر ترقی دے کر ایماندار ملازمین کے حقوق غصب کئے جاتے ہیں۔
- ترقیاتی کاموں کے ٹھیکے، رشتے داروں، عزیزوں اور دوستوں کو دیئے جاتے ہیں۔
- عمارتوں اور ترقیاتی کاموں میں ناقص میٹریل استعمال کیا جاتا ہے۔

بلا تبصرہ

تفہیم القرآن کی تقریب میں ہزار روپے کی کراکری غائب

لاہور۔ ہوٹل فلیٹیز کی انتظامیہ ان دنوں ہزاروں روپے کی گمشدہ کراکری تلاش کرنے کی فکر میں ہے۔ یہ کراکری جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی کی تصنیف "تفہیم القرآن" کی تکمیل پر منعقدہ تقریب کے دوران گم ہوئی۔ یاد رہے ۳۰ جون کو اس سلسلے میں ہوٹل فلیٹیز میں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چائے کے دوران ہوٹل انتظامیہ کو شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ حاضرین کی طرف سے بار بار چینی کا تقاضہ کیا جاتا رہا۔ تقریب کے اختتام پر یہ پریشانی اور بڑھ گئی۔ کیونکہ تقریباً دو ہزار روپے کی کراکری کم تھی۔ حاضرین کو جن برتنوں میں چائے پیش کی گئی ان میں سے چمچے، چینی اور دودھ کے برتن غائب تھے۔ ہوٹل انتظامیہ کے مطابق چند برتن برآمد بھی کرلئے گئے۔ اس کے باوجود تقریباً دو ہزار روپے کا نقصان ہوا۔

بشکریہ مساوات۔ لاہور

وہ نفرت انگیز زمینداروں کا خاتمہ کرکے غائب ہوجاتے ہیں : صفحہ ۴۴ سے آگے

۸ر اگست ۱۹۷۰ء کو ایک انتہائی رجعت پرست جاگیردار جو ریاست کی سوتنترا پارٹی کا قومی اسمبلی میں واحد ممبر اور پارٹی کا جنرل سیکرٹری بھی تھا اسے گوریلوں کے ایک گروپ نے پٹیالہ ضلع کے ایک بڑے فارم میں واصل جہنم رسید کر دیا۔ جاگیرداروں کی پولیس نے کسان خاندانوں اساتذہ اور طلباء پر انسانیت سوز مظالم توڑے مگر گوریلوں کا کھوج لگانے میں ناکام رہی۔

۴ر اپریل ۱۹۷۱ء کو پنجاب کے سنگرور ضلع کے گاؤں جانگلیہ میں چار غریب کھیت مزدور گوریلوں نے انتہائی بدمعاش پولیس ایجنٹ گوہندر نامی شخص کو اپنے خنجروں کا نشانہ بنایا اور اس کی دونالی بندوق کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ یہ غنڈہ دراصل قریبی گاؤں میں پولیس ایجنٹوں کے سرغنہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک بار ایک غریب ضعیفہ کسان خاتون نے گوریلوں سے سوال کیا تھا "لڑکو ... ! اس ظالم کے ظلم کے دن کب پورے ہوں گے ؟" پھر وہ پولیس اسٹیشن سے صرف ایک میل کی دوری پر اپنے گھر کو جانے والے راستہ ہی میں قتل کر دیا گیا۔ طبقاتی دشمنوں کے خلاف شدید نفرت سے بھرپور ان گوریلوں نے اس کا کام تمام کیا۔ اپنی کامیابی پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے اور پھر عوامی ہجوم میں غائب ہوگئے۔

اس قسم کے حادثات ہر روز بڑھتے جا رہے ہیں۔ مصدقہ ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ اپریل میں پنجاب کے ضلع سنگرور اور دوسرے ضلعوں میں کسان گوریلوں کو آٹھ تو مسلح کارروائیاں کرنی پڑیں۔

جدوجہد کی نئی شکل

بھارتی کسانوں کو اپنی مسلح جدوجہد میں جیت بھی ہوئی اور ہار بھی، مگر انہوں نے اپنے تجربوں کا تجزیہ کرکے اپنی طاقت کو دوبالا کر لیا ہے

اب وہ دشمنوں سے مقابلہ کرتے وقت بہترین موقع کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے دشمنوں کی عیاری کے مقابلہ میں اپنی عقل کا استعمال کرتے ہیں اور اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھاتے جب تک کہ عوامی خیالات اور ماحول پوری طرح سازگار نہیں ہو جاتے۔ نکسل باڑی کے علاقوں میں گوریلوں نے دشمنوں سے بارہ مقابلے کیے جن میں سے نو مقابلوں میں مکمل کامیابی ہوئی۔ دشمنوں نے گھیراؤ اور جلاؤ اور ظلم اور تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر انہیں منہ توڑ ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دشمن نہ صرف انقلابی کسانوں کو زیر کرنے میں بُری طرح ناکام ہوئے بلکہ انہوں نے کسانوں کے عزم و استقلال کو اور مضبوط کر دیا۔ کسان کثیر تعداد میں گوریلا فوج میں بھرتی ہوئے ہیں۔

گوریلوں کی اکثریت کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ صرف لڑائی کی خاطر نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ ان کا مقصد عوام میں اپنے نظریہ کو مقبول بنانا اور انہیں منظم اور مسلح کرنا ہے۔ چنانچہ ان کی تمام تر کوششیں عوام کی سیاسی تعلیم اور کسانوں سے اپنے رابطے کو مزید مستحکم کرنے پر مرکوز ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں عوام میں گھل مل کر ان کی سیاسی تعلیم کی باتیں شروع کرتے ہیں جب

بھارت کے کسان

بڑی تعداد میں عوامی

سپاہ آزادی میں

شامل ہو رہے ہیں

کسانوں کا طبقاتی شعور بلند ہوتا ہے تو گوریلے پانی میں مچھلی کی طرح محفوظ ہوتے ہیں — وہ عوام میں کھلے عام گھومتے پھرتے ہیں جو ان کی حفاظت کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ کسان گھرانوں کے افراد بن جاتے ہیں۔ اور جاگیرداروں کی رجعت پرست پولیس ان کا کھوج لگانے میں ناکام ہو جاتی ہے۔

جب انہیں دشمن کی سرکوبی کا کام سپرد کیا جاتا ہے تو پھر وہ جمع ہو جاتے ہیں اور اپنی صف آرائی اس طرح کرتے ہیں کہ کبھی شبخون مارا تو کبھی دشمن کو کمزور پاکر بڑی تعداد سے حملہ کر دیا اور پھر کبھی اچانک چھاپہ مار دیا وغیرہ وغیرہ! جب کبھی وہ دشمنوں کے خلاف کوئی کارروائی کرتے ہیں تو اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ دشمنوں کی عوام دشمن سرگرمیوں اور ان کے جرائم کا پوری طرح پردہ چاک کرکے اس کی تشہیر کریں تاکہ کسانوں کی ہمدردیاں اور حمایت حاصل کی جا سکیں۔

سیاسی تعلیم کے ذریعے عوامی شعور کے ابھار سے جو طاقت جنم لیتی ہے اس کی مثال ایسے چھوٹے چھوٹے چشموں جیسی ہے جو آخرکار متلاطم دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

مسلح جدوجہد دیہاتوں میں دور دور تک پھیلتی جا رہی ہے اور مزدوروں کی اکثریت اس میں شمولیت اختیار کر رہی ہے۔ مغربی بنگال کے بردوان ضلع میں مختلف مقامات پر مزدور اور کسان ایک دوسرے کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں اور زرعی انقلاب عمل میں لا رہے ہیں۔ شہروں میں مزدوروں نے تشدد کے خلاف اور سماج میں اپنی جائز حیثیت کو منوانے کے لیے بہت سی کامیاب تحریکیں چلائیں۔ دیہاتوں کی مسلح جدوجہد نے طلباء اساتذہ اور خصوصاً پرائمری اسکول کے اساتذہ کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ بے شمار طلباء اور اساتذہ نے عوام سے گہرا رابطہ پیدا کرکے بڑی بے جگری سے اپنی اور عوام کی مدافعت کی ہے اور سماجی بھلائی کے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔

ایک چنگاری پورے گیاہستان میں آگ لگا سکتی ہے۔ ایک انقلابی طوفان ہندوستان میں منڈلا رہا ہے جو پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پچاس کروڑ کی آبادی ایک عظیم انقلابی قوت کو جنم دے گی جو کہ اس ملک کی تیرگی و تاریکی کو ختم کرکے اسے حقیقی عوامی آزادی کی صبح کی خوش آئند روشنی عطا کرے گی۔

بقیہ : احوال واقعی

ہے۔ کیونکہ حکومت میں شمولیت کے بعد نیپ کو بھی حکومت کی ہر کارروائی میں شریک تصور کیا جائے گا اور یوں نیپ اپوزیشن کے دعوے نہ کر سکے گی۔ اگر نیپ نے اپوزیشن کا رنگ نہ چھوڑا اور حکومت کی مخالفت جاری رکھتے ہوئے اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش جاری رکھی تو معاہدے کا چلنا یقیناً مشکل ہوگا۔

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ بنگلہ دیش پر چین کے ویٹو کے سلسلے میں روس کی ناراضگی متوقع ہے۔

روس بین الاقوامی پلیٹ فارم پر کچھ نہیں کر سکتا وہ اپنے لوگوں کے ذریعے پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کر سکتا ہے پہلے سندھ بلوچستان میں ایسا ہو بھی چکا ہے۔ ان متوقع کارروائیوں کو روکنے کے لیے بھی یہ معاہدہ اور نیپ کو ہر سطح پر حکومت میں شریک کرنا سیاسی طور پر ضروری تھا۔

بہرحال اس ساری کارروائی میں ہمیں "قیوم خان" قربانی کا بکرا بنتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ خدا خیر کرے ان کے لیے ابھی سے کہیں سفارت تلاش کر لینی چاہیئے۔

بقیہ: پیپلز پارٹی کی تنظیم

کے بہانے پر کافی کچھ کر رہے ہیں۔

۷۔ پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔

۸۔ یہ بالکل درست ہے کہ لوگ پولیس، نوکر شاہی اور عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں۔ اس کے لئے میں نے پچھلے دنوں ایک اخباری بیان بھی دیا تھا جو کچھ اخباروں میں چھپ چکا ہے۔

ضلعی کنونشن بلوایا جائے

رشید میر۔ نائب صدر پیپلز پارٹی
جھنگی محلہ پنڈی

۱۔ برسر اقتدار آنے کے بعد پیپلز پارٹی کا کردار بالکل بدل گیا ہے اور اپنے منشور پر عمل نہیں کر رہی ہے۔

۲۔ جب تک نوکر شاہی کا غلبہ ہے اُس وقت تک عوام کی توقعات پوری نہیں ہو سکتیں۔

۳۔ پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ تنظیم پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

۴۔ سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا ہمارے ساتھ اچھا سلوک ہے۔

۵۔ ہر ماہ پارٹی کی شہری اور ضلعی تنظیموں کا اجلاس طلب کیا جائے اور کارکنوں میں سیاسی لوچ اور اتحاد پیدا کیا جائے۔

۶۔ یہ الزام غلط ہے۔

۷۔ پارٹی کا حکومت پر کنٹرول ہونا چاہیئے ورنہ پیپلز پارٹی کنونشن لیگ بن جائے گی۔

۸۔ یہ الزام بھی سراسر بے بنیاد ہے۔

پارٹی پر وڈیروں کی اجارہ داری ہو گئی ہے

عبدالستار خان
حاجی عیسیٰ گوٹھ۔ کراچی

۱۔ پیپلز پارٹی برسر اقتدار آنے کے بعد کنونشن لیگ کی راہ پر گامزن ہے۔ منشور کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ روٹی کپڑے اور مکان کا وعدہ پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

۲۔ پارٹی پر بڑے بڑے وڈیروں کی اجارہ داری قائم ہو جانے سے عوامی توقعات پوری نہیں ہو سکتیں۔

۳۔ قیادت اور کارکنوں میں کوئی رابطہ نہیں ہے۔

۴۔ جناب معراج محمد خان کے باقی سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنما کارکنوں سے ملنے سے کتراتے ہیں۔ اب تو باقاعدہ تعارف کرانے کی ضرورت پیش آنے لگی ہے۔

۵۔ کارکن اب بھی منظم ہیں لیکن پارٹی کے بعض مفاد پرست عناصر متوازی دفتر کھول کر پارٹی کی تنظیم کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

۶۔ ہمارے علاقہ میں بعض مفاد پرستوں نے پارٹی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔

۷۔ عوامی جمہوریہ چین کی طرح پاکستان میں بھی حکومت پر پارٹی کا کنٹرول ہونا چاہیئے۔

۸۔ ایک معمولی کارکن کی کیا مجال کہ وہ عدلیہ، پولیس اور انتظامیہ کے کاموں میں مداخلت کرے۔

بقیہ: پاکستانائزیشن

ہمیں اپنے آپ کو اندرونی طور پر مستحکم کرنے کے لئے بھی ہر وقت کام کرنا ہے۔ بھارت ہمارا ہمسایہ سہی اور امن کے سلسلے میں اب خلوص کا مظاہرہ بھی کرے۔ مگر ہماری اور بھارت کی سوچ بالکل مختلف ہے — اس کی بیرونی وابستگیاں — بھی ہم سے تصادم کی پالیسی کی بنیاد پر ہیں۔ اندرونی طور پر بھی وہ اپنے ہر شعبے میں پاکستان کی مخالفت کو بنیاد بنائے ہوئے ہیں۔ اب جب وہ امن کی زبان میں بات کر رہے ہیں تو وہ ہمارے ملک میں تخریبی کارروائیوں کا سلسلہ شروع کریں گے۔ کانگریس کی ہائی کمان نے پاکستان کے وجود کو اپنے لئے ہمیشہ ایک سیاسی چیلنج سمجھا ہے۔ اس لئے وہ اس کو ختم کرنے کے لئے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ اب اگر وقتی طور پر بھارت کے ریڈیو اور اخبارات نے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ بند کر دیا ہے تو یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ بھارت کو پاکستان کے ساتھ محبت ہو گئی ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود جنگ ان مسائل کا حل نہیں ہے کیونکہ پاکستانی قوم کو بھارت سے فوجی تصادم نہیں۔ بلکہ نظریاتی تصادم کی ضرورت ہے۔ پاکستانی قوم پرستی بمقابلہ بھارتی قوم پرستی — جن سنگھ بھارت میں "انڈیانائزیشن" — پورے علاقے کو بھارتیانے کا مشورہ دے رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمیں "پاکستانائزیشن" — پاکستانیانے کی جدوجہد کرنی ہے۔ یہ پاکستان کے دانشوروں، سیاسی کارکنوں، مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کو فیصلہ کرنا ہے کہ "پاکستانیانے" کا عمل کن مراحل سے گزرے گا۔ باقی ماندہ پاکستان کے پٹھانوں، بلوچوں، سندھیوں اور پنجابیوں کو "پاکستانیانے" کا عمل رات دن جاری رکھنا چاہیئے۔

اب جذبات پرستی کو چھوڑ کر ہمیں انتہائی تلخ حقائق کو سامنے رکھ کر قدم بڑھانا ہوں گے۔ جنگی جنون سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ ہماری عددی طاقت، اسلحی طاقت بھی بھارت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ پھر ہم اندرونی طور پر بھی منظم اور متحد نہیں ہیں، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بھارت سے مقابلے کا جذبہ صرف اہل پنجاب اور اہل کراچی میں ہے۔ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے لوگوں میں بھارت سے تصادم کا یہ جذبہ نہیں ہے۔ ان چاروں صوبوں میں اس بنیادی مسئلے پر یک جہتی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے سوچنے کا جذبہ ایک سا ہو — اس وقت اگرچہ ہماری اپنی حماقتوں سے بعض افسوس ناک واقعات پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ نتیجہ بہرحال بھارت کے مسلسل پروپیگنڈے کا ہے کہ اس نے پاکستان کی مختلف قومیتوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار کر دیا ہے۔ بھارت کے علاوہ روس کا بھی اس میں بہت بڑا حصہ ہے — نیشنل عوامی پارٹی — بھارت اور روس کی لائن کو مکمل طور پر اپناتی ہے۔ سندھ میں بھارت کے سندھی ریڈیائی پروگرام نے انتہاپسندی پیدا کی ہے اس انتہاپسندی نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو بھی اپنے سامنے سر جھکانے اور کراچی کے عوام کا خون بہانے پر مجبور کر دیا۔ یہ سلسلہ بالواسطہ بھارت کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔

بقیہ: اداریہ

جس قدر مذمت کی جائے کم ہے۔ مرکزی حکومت کو اسے حکومت سرحد کا مسئلہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ صوبہ سرحد میں کسانوں کے قتل عام کی تحقیقات کے لئے ایک اعلیٰ سطحی کمیشن قائم کیا جائے جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے فاضل جج ہوں۔ تحقیقاتی رپورٹ عوام کے سامنے پیش کی جائے اور قصوروار افراد کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
24- 31, AUGUST. 1972